تلاش

تیج بہادر

ناشر...... راٸٹرس پبلشرس

نام .... تلاش

مصنف.... تیج بہادر بھان

A-73 لال نگر

سرینگر۔ کشمیر۔ 190015

اشاعت 1989ء

قیمت .... چالیس روپے

تعداد....... 600

خوش نویس :۔ محمد افضل اندرابی

سرورق :۔

پریس :۔ نیو پبلک پریس دہلی

• ۔ اس کتاب کی اشاعت کے لئے کلچرل اکادمی نے بھی مالی معاونت کی ہے جس کے لئے میں اکادمی کا شکر گذار ہوں۔

(مصنف)

انتساب

محمد یوسف تارِگامی کے نام :-

" آؤ مل کر اندھیروں میں اُجالا کریں "

ترتیب

زندگی

وہ بہت دیر سے ایسے بیٹھا رہا جیسے برف کا بے جان تودہ۔ نہ کوئی آہ اُس کے بے حس بدن کو جھنجھوڑ سکی، نہ کوئی سسکی اُس کے ٹھٹھرتے وجود کو چیر سکی۔ اور نہ ہی کوئی احساس اُس کے جمود کو پگھلنے پر مجبور کر سکا۔ صرف اُس کا سیال ذہن، اُبلتا کھولتا ذہن، برسوں کے نشیب و فراز پر کبھی کسی بیقرار ندی کی طرح سر پٹختا رہا۔ کبھی کسی مہیب دریا کی طرح ٹٹولتا رہا اور کبھی کسی ڈراونے آبشار کی طرح پریشان رہا۔

یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کی "خورشی"..... اُس کی اپنی خورشی اُسکو چھوڑ چلی ہے۔ پچیس ۲۵ برس کا لمبا ساتھ توڑ گئی ہے۔ لمحے بھر کے لئے اُسے ایسا لگا جیسے خورشی نے اُسے دغا دی ہے بے وفائی کی ہے۔ محسوس ہوتے ہی اُسکے دل میں آگ سی بھڑک اُٹھی۔ جی چاہا دنیا کو ویران کر دے، کائنات کو تہہ و بالا کر دے۔ راکھ کر دے سب کو..... کچھ نہ کر سکے تو کم از کم اس مسجد کی بنیاد کو ہی ہلا ڈالے جس کی چار دیواری میں اُس کی خورشی روٹھ گئی تھی.......

اُس کی خورشی مر گئی تھی۔

"خورشی مر گئی..... خورشی مر گئی..... خورشی مر گئی....." ذہن میں بجلی کے کوندے لپکے اور برف پگھلنے لگی۔ وہ پانی کے حقیر قطرے کی طرح بے سہارا

ہو گیا۔ آنکھوں کے سوتے اُمڈ پڑے اور وہ ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگا لیکن اُسے دلاسا دینے کوئی نہ آیا۔ بھلا مسجدوں میں رات گئے خدا کے بغیر کون آتا ہے اور آج خدا نے بھی اُس سے منہ موڑ لیا تھا شاید، ورنہ خورشی یوں بے موت نہ مرتی۔ گاؤں میں ڈاکٹر نے اُسے اُمید دلائی تھی کہ شہر جا کر خورشی کا بڑے ہسپتال میں علاج ہو گا اور وہ ضرور ڈھلتی عمر میں باپ کا رتبہ حاصل کرے گا۔ اس لئے برف و باراں کے باوجود وہ خورشی کو شہر لے آنے پر تیار ہو گیا تھا۔ جوں توں اُس نے خورشی کو گاؤں میں بس پر لاد دیا تھا لیکن شہر پہنچ کر بس سے اُترتے ہی خورشی کی حالت ابتر ہو گئی تھی۔ شام کے ملگجے اور برف باراں میں ہسپتال پہونچنا محال تھا اس لئے اُس نے پاس کھڑی مسجد کا سہارا لیا۔ سوچا تھا خدا کا گھر ہے کسی خطرے کی گنجائش نہیں ہے لیکن وہ شاید گناہ گار تھا۔ بہت بڑا گناہ ہوگا خدا کے گھر میں بھی قہر خدا سے بچ نہ پایا۔

مسجد کے دروازے کو پار کرتے ہی خورشی درد اور بخار کی وجہ سے لڑکھڑا گئی۔ دیواروں کا سہارا میسّر نہ ہوتا تو وہ دونوں سیڑھیوں پر ہی ڈھیر ہو گئے ہوتے۔ بڑی مشکل سے وہ خورشی کو مسجد کے کمرے میں پہنچانے میں کامیاب ہوا لیکن کمرے کے بیچ پہنچتے ہی خورشی یوں تڑپنے لگی جیسے پانی سے باہر پھینکی ہوئی مچھلی۔ اس حالت میں خورشی کو اکیلا چھوڑ کر جانے کی ہمت اُس میں پیدا نہ ہو سکی، کیا معلوم کہ ڈاکٹر ملے یا نہ ملے کہاں ملے، کدھر ملے؟ باہر برف گر رہی تھی۔ ٹھنڈ شدّت سے بڑھتی جا رہی تھی اور مسجد کی فضا بھی ٹھٹھرتی جا رہی تھی۔ اُس نے کندھے سے لوئی اُتار کر خورشی کو اوڑھا دی۔ لیکن پھیلتی بڑھتی ٹھنڈ لوئی کے مسام پار کر کے

خورشی کے ہر مسام میں سرایت کرتی گئی۔ حتیٰ کہ خورشی کی تڑپ جم گئی۔ خورشی کی سانس جم گئی۔

وہ روتے روتے رک گیا۔ اُس نے خود ہی اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ بھلا رونے سے فائدہ؟ اُس کے آنسوؤں کی گرمی خورشی کے ٹھنڈے جسم کو گرم کرنے کی سکت رکھتے تو خورشی کب کی زندہ ہو گئی ہوتی۔ اس کا وجود تو منوں آنسو بن کر بہا تھا۔ اس مسجد کی نم فضا میں۔ تعجب تھا کہ مسجد کیوں نہ بہہ گئی......!

کاش وہ خورشی کو ایسی بری حالت میں شہر لانے کی غلطی نہ کرتا۔ طویل بیماری نے خورشی کے انگ انگ کو کمزور کر دیا تھا۔ بس کے ہچکولوں نے انگ انگ کو مار کے رکھ دیا اور وہ بدبخت "باپ بننے کے لالچ میں خورشی کو گھسیٹتا پھرا۔ خدا کو قصوروار گردانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر قصور تھا تو اُس کا اپنا قصور تھا۔ وہ خود...... صرف خود خورشی کی موت کا ذمہ دار تھا۔ خورشی کا قاتل تھا اور قاتل کی سزا ہوتی ہے موت...... ہاں موت...... اُس کو مرنا چاہیے۔ اُس کو ضرور مرنا چاہیے۔ ویسے بھی اب اُس کا جینا بے کار تھا۔ خورشی مر گئی تھی اور اس کو بے ثمر ٹُنڈ مُنڈ درخت کی طرح اکھاڑ گئی تھی۔ بھلا زمین کے بغیر بیج کہاں جڑ پکڑ سکتا ہے۔ اب اُس کی زندگی بے کار تھی۔ جدوجہد بے کار تھی۔ کاش یہ ٹھنڈ دھیرے دھیرے اُس کے ہر مسام میں بھی سرایت کر جاتی۔ اُس کے ہر مسام میں بھی جم جاتی۔ تو شاید وہ بھی خورشی کی طرح جم کر رہ جاتا اور یوں شاید اُس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا۔

وہ اُٹھا اور خورشی کے سرہانے کی طرف بڑھا۔ خورشی کا منہ کھلا ہوا تھا

آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور چہرے پر عجیب سی بے بسی چھائی ہوئی تھی۔ بے بسی کی تیز لہر اُس کے اپنے بدن پر چھا سی گئی۔ اُس کی آنکھیں پھر سے دھندلانے لگیں، وہ اور نہ سہہ سکا اُس نے جلدی سے لوئی کھینچ کر خورشی کے چہرے کو ڈھک دیا اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اُترتا ہوا مسجد سے باہر آگیا۔

برف بدستور گر رہی تھی اور ساری سڑک برف سے ڈھک چھپ گئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں اُجلی اُجلی کفن سی لگ رہی تھی۔ برف کے گالے اُس کے جلتے بدن پر پگھل کر سوئیاں سی چبھوتے رہے لیکن وہ ہر تکلیف سے بے نیاز اندھیرے کی چادر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ کلبلاتے ذہن میں اندازے کی مبہم لکیریں اُبھر آئیں۔ سڑک کو ٹھیک مسجد کے سامنے عبور کر کے مُنہ پھاڑے گلی میں جا گھسے۔ اور تھوڑی دور جا کر داہنی سمت گھوم کر آگے بڑھے تو دریا پہنچ جائے گا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی بس ایک لمبے پل پر سے گزر آئی تھی اور پل کے نیچے دریا پانی سے لبالب بھرا ہوا دکھائی دیا تھا۔ بس...... ذرا سے ارادے کی ضرورت تھی۔ تھوڑی سی ہمت کی ضرورت تھی دو ایک ڈبکیاں برداشت کرنی تھیں۔ باقی سارا کام برفیلا پانی خود بخود انجام دیگا۔ ٹھنڈ ہر مسام میں سرایت کر جائیگی۔ اعضا سُن ہو جائیں گے۔ جدو جہد منجمد ہو جائیگی۔ تڑپ جم جائیگی۔ سانس جم جائے گی۔ اور وہ بھی آخر کار خورشی کے پاس پہنچ جائے گا۔ رات کے اندھیرے میں خدا بھی اُسے روک نہ سکے گا۔

کئی سڑکیں اور ان گنت گلیاں پار کر کے بھی اُس کو دریا نہ ملا۔ گلیوں

کوچوں کی بھول بھلیوں میں اتنا بڑا دریا بھی گم ہو کے رہ گیا تھا جیسے اس دنیا کی مختلف گلیوں کوچوں میں ان گنت دریا گم ہو جاتے ہیں۔ یا جیسے اُس کی خودکشی بھی کہیں گم ہو گئی تھی۔ وہ جھنجلا اُٹھا۔ کیا ضرورت تھی دریا ڈھونڈنے کی وہ مرنا چاہے تو سر پھوڑ کر بھی مر سکتا تھا۔ واقعی کوئی ضرورت نہیں دریا ڈھونڈنے کی اِس دُنیا میں اینٹ پتھر کی کمی نہیں ۔۔۔۔۔!

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، پاس کوئی پتھر نہ ملا۔ برف کی دبیز تہہ نے ہر پتھر کو اس کی ڈھونڈتی نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا، جان بوجھ کر چھپا رکھا تھا شاید۔ وہ غصے سے پھنک اُٹھا۔ پاگلوں کے مانند وہ سڑک کے اطراف میں کھڑے مکان کی دیواروں کو ٹٹولنے لگا۔ ہر مکان اینٹ گارے کا بنا تھا۔ اور نم کی وجہ سے ہر اینٹ ملائم ہو گئی تھی۔ ٹٹولتے ٹٹولتے اُس کی انگلیاں ٹھنڈ کے مارے اکڑ گئیں۔ جی چاہا کچھ دیر تلاش روک دے اور انگلیاں گرم سانسوں سے گرم کر لے۔ لیکن انگلیاں اینٹوں میں چُنے ایک نوکیلے پتھر سے ٹکرا گئیں۔ وہ بہت دیر پتھر کو یوں پکڑے کھڑا رہا کہ کہیں پتھر بھی دغا نہ دے جائے۔ جیسے اُس کی اپنی خودکشی نے دغا دی تھی۔

پتھر سر کی سیدھ سے بہت نیچے تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کی سُن انگلیاں پتھر کے کناروں کو کریدنے لگیں۔ پتھر باہر آئے تو اُس کے شل بازوؤں میں ابھی اتنی سکت باقی تھی کہ پتھر سر پہ دے مارے۔

کہیں سے کوئی نیند میں بڑبڑایا۔ گلی کی خاموشی میں ارتعاش سا پیدا ہوا اور وہ گھبرا کر سڑک پہ بیٹھ گیا۔ پتھر سر کی سیدھ میں آ گیا۔ اس کے منہ سے

بے اختیار بڑبڑانے والے کے حق میں دعا نکلی۔ اس کی مشکل آسان ہو گئی تھی۔

اُس نے پتھر کو ایک بار پھر ٹٹولا۔ اندازے سے سر کو پتھر کی نوک کے سامنے کر دیا۔ ایک لمبی سانس لی اور سر کو زور سے دیوار سے دے مارا۔ سر بج اٹھا آنکھوں کے سامنے تارے ناچ اٹھے۔ حلق سے چیخ اُبھر آئی۔ درد کی شدت سے سارا بدن بے قابو ہو گیا اور وہ منہ کے بل برفیلی سڑک پر لڑھک گیا۔

اعصاب سُنسناتے رہے، سنسناتے رہے حتیٰ کہ حرکت کرنی مشکل ہو گئی۔

بڑی کوششوں کے بعد وہ دیوار کے سہارے بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔

سر سے خون بہہ رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو۔ اُس نے قمیض کے بازو سے آنسو پونچھے اور اُس کا سارا چہرہ برف اور کیچڑ سے لتھڑ گیا۔ کاش وہ کسی طور مر سکے اس دُنیا سے نجات حاصل کر سکے، بے رحم دُنیا کے بے رحم تھپیڑوں میں اکیلے بہنے کی سکت اب اس کی بوڑھی ہڈیوں میں نہ تھی۔

سر میں گہری چوٹ، آنے کی وجہ سے ذہن بھی گڈمڈ ہو رہا تھا۔ نگاہیں دھندلا رہی تھیں، شاید برف کی سفیدی نگاہوں کو دھندلا رہی تھی یا شاید آنسوؤں کی دھار۔ وہ فیصلہ نہ کر پایا۔ لیکن دھند کے مرغولے۔ ناچتے گھومتے تاریک فضائیں بدستور پھیلتے جا رہے تھے۔ مرغولے ناچتے گھومتے تاریک تاریک فضائیں اُبھرتے خورشی کے چہرے میں مدغم ہوتے رہے اور تاریک فضائیں خورشی کا چہرہ اُبھر آتا رہا تھا وہی سڈول چہرہ، وہی موٹے موٹے ہونٹ وہی چھوٹی سی نازک نوکیلی ناک اور وہی بے انتہا کالی گہری آنکھیں، جن آنکھوں کی گہرائیوں میں اُس نے کتنی بار اپنے آپ کو ڈبونے کی کوشش کی تھی۔

ہاں.... وہی کالی گہری آنکھیں جن کی گہرائیاں اُس کی سمجھ سے بھی گہری تھیں۔ گہری گہری کالی آنکھیں اِس رات کی...... ساری تاریکیاں سمیٹے ہوئے، سارے درد کا طوفان چھپائے ہوئے، سارے آنسوؤں کے دباؤں سے لبریز۔ اُس کا جی ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ خورشی کی آنکھیں اُس کو بُلا رہی تھیں۔ دعوتِ وصل دے رہی تھیں۔ کہیں دیر نہ ہو جائے اور خورشی اُس کی پہنچ سے باہر گھومتے، ناچتے، پھیلتے مرغولوں میں کھو جائے، اُس کے ہاتھ بے اختیار آگے بڑھے۔ برف کے گالے ہاتھوں پر گرتے ہی نشتروں میں تبدیل ہو گئے وہ کانپ اُٹھا۔ نگاہیں خالی ہاتھوں پر جم گئیں۔ ہاتھ کیچڑ سے لتھڑے ہوئے تھے اور انگلیاں سردی نے جکڑ رکھی تھیں، یا شاید سردی اُس کے ارادوں کو جکڑ رہی تھی۔ وہ پھر اُٹھا۔ اُس نے انگلیاں اپنے گلے سے لگائیں۔ رُوک لے اب سردی اُس کے ارادوں کو۔ ٹھنڈی انگلیوں کو گلے کا جلتا لمس اچھا لگا۔ لمحہ بھر کے لئے گرمی کی میٹھی لہر اُس کے ٹھٹھرتے وجود میں رواں ہو گئی۔ لذت کی انتہا نے اُس کی انگلیوں میں پھرتی بھر دی۔ گلے کے پٹھے احتجاج کر بیٹھے اور کھانسی کا دورہ اس شدت سے پڑا کہ ہاتھ گلے سے الگ ہو گئے۔ بدن دُہرا گیا۔ پیٹ کھنچنا اُٹھا۔ آنتیں جُرمرا گئیں اور وہ بے حال ہو گیا۔ اپنا گلا گھونٹنا اتنا آسان نہیں تھا شاید۔ بے حال، وہ گرتا پڑتا بڑھتا گیا۔ اندھا دھند بڑھتا گیا۔ نہ سمت کا اندازہ تھا نہ منزل کا پتا تھا صرف درد کی شدت کا احساس تھا جس نے اُس کے وجود میں آگ سی لگا دی تھی۔ آگ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ پھیلتی جا رہی تھی۔ کائنات کو اپنے لپیٹ میں لیتی جا رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں چندھیا

اُٹھیں۔ ساری سڑک چنگاریوں کی بوچھاڑ میں نہا گئی۔ جیسے اُس کا جلتا بُھکتا وجود سڑک پر بکھر گیا ہو۔ گھبرا کر اُس نے اپنی آنکھیں مسل لیں۔ چنگاریاں آگ کے دریا میں ڈوب گئیں۔ آگ کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ دھاڑنے لگا حتیٰ کہ اُس کے کان بج اُٹھے۔ جس چیز کی اُس کو ازل سے تلاش تھی وہ اُسے مل گئی۔ آخر کار اُس کو دریا مل گیا۔ بے تحاشہ اُس نے اپنے آپ کو دریا میں گرا دیا۔ گھٹنوں میں چوٹ کا احساس ہوا لیکن درد محسوس نہ ہوا۔

ٹرک پاس آکر رُک گیا۔ ہیڈ لائیٹ (HED LIGHT) کی تیز روشنی میں کئی سائے اُبھرے۔ کسی نے اُسے جھنجھوڑا۔ کسی نے اُسے سڑی سودائی کہا اور کسی نے اُسے گھسیٹ کر سڑک کے کنارے ڈال دیا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز نے لمحہ بھر کے لئے پھر ایک بار فضا کو بوجھل کر دیا اور دوسرے لمحہ آہستہ آہستہ ایسے مر گئی جیسے اُس کے ارادے مر رہے تھے۔ بے اختیار اُس کے منہ سے ایک لمبی سِسکی اُبھر پڑی جس کے بوجھ تلے روشنی کا دریا بھی دب کے رہ گیا۔

طوعاً کرھاً وہ اُٹھا۔ دھند کے مرغولے لڑکھڑا رہے تھے۔ برف کے گالے لڑکھڑا رہے تھے۔ سڑک کے اطراف میں کھڑے مکانوں کے تاریک سایے لڑکھڑا رہے تھے۔ سڑک بذاتِ خود لڑکھڑا رہی تھی حتیٰ کہ اُس کی اپنی ٹانگیں بھی لڑکھڑا رہی تھیں۔

کائنات لڑکھڑا رہی تھی یا اُس کی ناکامی پر ناچ رہی تھی۔ غور کرنے کی سکت نہ تھی اُس کے لڑکھڑاتے وجود میں۔ صرف بے انتہا درد کا احساس تھا بدن میں۔ جس میں خالی پیٹ میں بڑھتی ٹیسیں بھی رواں ہونے لگی تھیں۔ بھوک کے احساس

نے اُس کے تھکے پٹّے اعصاب میں نئی پھرتی پیدا کی اور وہ بے ارادہ، بے مقصد بڑھتا رہا..... لڑکھڑاتا رہا۔

مسجد کے دروازے کو پا کر اُسے بے انتہا تسکین ملی شاید منزل سامنے تھی۔ گرتا پڑتا وہ مسجد کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کمرے تک پہنچ کر وہ تھکن سے بے حال ہو گیا۔

کمرے کے بیچ خورشی لوئی میں ویسے ہی لپٹی پڑی تھی جیسے وہ چھوڑ گیا تھا۔ لوئی کو دیکھ کر اُس کو ٹھنڈک کا بے انتہا احساس ہوا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس نے خورشی کے اُوپر سے لوئی ہٹانی شروع کی۔ خورشی کا چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ ہونٹ ڈراونے حد تک تن گئے تھے اور چہرے کی ہڈیاں خطرناک طور پہ اُبھر آئی تھیں۔ اُس کے ہاتھ تھر تھر کانپنے لگے۔ لمحہ بھر کے لئے اُسے اپنی حرکت پہ نفرت سی ہوئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ساری نفرت بھوک نیند اور درد کے بوجھ تلے دب کے رہ گئی۔

جلدی سے لوئی کھینچ کر وہ خورشی سے دور ہٹ گیا کمرے کے کونے میں اُس نے لوئی کو اپنے چاروں اور لپیٹ لیا اور دیوار سے پیٹھ لگا دی۔ گرمی کی میٹھی لہریں اُس کے جسم کا طواف کرنے لگیں، اُس کے بند بند کو ڈھیلا کرنے لگیں۔ کاش بھوک پیٹ میں اُدھم نہ مچائے اور سر میں درد کی شدت کچھ کم ہو جائے۔

اُس نے بدن کو پھیلایا۔ خورشی کی طرف ایک آخری تھکی معذرت آمیز نگاہ ڈال دی اور نیند کی آغوش میں لڑھک گیا۔ ●

خلاء

یکایک ہارن کی آواز فضا میں گونج اُٹھی اور میرے ذہن کے ساتھ ساتھ میرا بدن بھی مچل اُٹھا۔ تارکول کی کالی سڑک سہارا دینے کے لئے آگے بڑھی۔ گھٹنوں پر چوٹ کا احساس نہ ہوا لیکن آنکھوں کے سامنے موت مچل اُٹھی۔

جب کئی ہاتھوں نے میرے سُن بدن کو سہارا دیا تب مجھے محسوس ہوا کہ پاس کھڑی کالے رنگ کی کار خوبصورت ہے اور کار کا ڈرائیور بھی ایک کالے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ہے اور سوٹ بے طرح لوگوں کے ہجوم میں سکڑ رہا ہے۔

میرے چہرے کو دیکھتے ہی سوٹ کھل اُٹھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لپکا اور مجھ سے اتنے زور سے چپک گیا کہ گھٹنوں کی چوٹ کا احساس واضح ہو گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کو پہچان لوں۔ لیکن مہلت ملی حواس درست کرنے کے لئے۔ اس کے مضبوط بازوؤں نے مجھے حقیر ڈھیلے کی طرح کار میں پھینک دیا۔ انجن سٹارٹ ہو گیا۔ لوگ ادھر اُدھر چھٹ گئے اور کار آگے کو پھسل گئی۔ کھڑکی میں سے ٹھنڈے جھونکے اندر آئے اور میرے حواس بحال ہونے لگے۔

کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ آواز غیر مانوس تھی پر خدوخال مانوس لگے۔ ذہن نے انگڑائی سی لی اور میرے منہ سے بے اختیار نکل

گیا "تم ..... تم .... ارے تم .....!"

"تمہارا اندازہ غلط نہیں۔ شکر ہے تم پہچان ہی گئے۔ میں پہچاننے میں دیر کرتا تو راہگیر میری جان ہی لے لیتے۔ چوٹ زیادہ لگی ہو تو ہسپتال چلیں۔" میرے بچپن کے لنگوٹیے یار نے کہا اور میں سلجھتے سلجھتے الجھنے لگا۔ صرف نفی میں سر ہلا کے رہ گیا۔

یوں تو سرینگر شہر کی صورت میں ایک آدھ زائد مکان یا سڑک نے کوئی خاص فرق نہ ڈال دیا تھا۔ لیکن لوگ بہت حد تک بدلے بدلے سے لگتے تھے۔ لوگوں میں وہ خلوص، وہ پیار، وہ برادری مفقود تھی جو صدیوں سے یہاں کے لوگوں میں موجود تھی۔ شاید قبائلی حملہ آور لوٹ مار کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ ساتھ لے گئے تھے جس کا احساس شاید لوگوں کو نہیں ہے یہ لوگ اتنے بدل جائیں گے کہ میرے بچپن کا لنگوٹیا یار، جو آٹھویں جماعت کبھی پاس نہ کر سکا۔ جس کو شرارتوں کی وجہ سے سکول بدر کیا گیا تھا اور جو محلے کا چھٹا ہوا بدمعاش سمجھا جاتا تھا۔ اور جو اصل میں میرا لنگوٹیا یار نہ تھا، شاید کسی کا بھی لنگوٹیا یار نہ تھا۔ صرف خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور اس کی مار پیٹ سے بچنے کے لئے ہم محلے کے بچے اس کے یار بنے پھرتے تھے۔ اس کی ہر بات پر لبیک کہتے تھے اور اس کی ہاں میں ہاں ملانے میں پیش پیش رہتے۔ اُسکی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہر جتن کرتے۔ وہی میرے بچپن کا لنگوٹیا یار اتنا بڑا آدمی بن جائے گا۔ اس کے بدن پر ریشم سے زیادہ ملائم، کمخواب سے بھی زیادہ چمکدار سوٹ۔ اس کے جھم جھم کرتے

جو توں میں مجھے اپنی صورت نظر آئے گی۔ اُس کی امریکن کار میں بیٹھ کر میں بھی تارکول کی کالی کھُردری سڑک پر ہوا کے جھونکوں کی طرح پھسلتا جاؤں گا۔ جبکہ بچپن میں پھٹے چیتھڑوں میں ملبوس ننگے پیر گھومنا ہی اُس کی قسمت میں تھا' اور جو ...... !

"کیا سوچ رہے ہو" میرے بچپن کے لنگوٹیے یار کی سرگوشی نے میرے اُلجھتے ذہن کو سلجھنے پر مجبور کیا۔

"سوچ رہا ہوں ہم بڑی مدت کے بعد مل گئے ہیں"

"واقعی بہت مدت کے بعد مل رہے ہیں۔ وقت اتنی تیزی سے گزر جائے گا یقین نہیں آتا۔" وہ شاید حجت کرنے پر آمادہ تھا۔ بچپن میں وہ ہر کسی بات پر حجت کرتا تھا۔ عادت جو ٹھہری۔

"اس قدر تیز نہ چلو میرا دل گھبرا رہا ہے۔" میں نے اُس کی عادت بدلنے کے لئے بات بدل دی۔ "لو سگریٹ پی لو' شاید تمہیں چوٹ لگی ہے کہیں آرام کرنا چاہیئے۔" اُس نے ڈیش بورڈ سے انٹرنیشنل کنگ کی سنہری ڈبیا نکال کر میری طرف اُچھال دی۔ "ڈیش بورڈ میں لائیٹر لگا ہے جلا دو ایک میرے لئے بھی ......"

امر سنگھ کلب کی بلڈنگ دیکھ کر میرے دل میں لمحہ بھر کے لئے وہی ڈر عود کر آیا جو بچپن میں آوارگی کرتے ہوئے اس بلڈنگ کے سامنے پہنچ کر میرے دل میں اُبھر آیا کرتا تھا۔ بلڈنگ بالکل نہ بدلی گئی تھی۔ وہی پرانی بلڈنگ کسی بوڑھے کھسوٹ کی طرح جس کے انجر پنجر بے ترتیب

پھیلے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے الگ ہونے کی کوشش کرتے محسوس ہوتے تھے۔ ویسے اردگرد احاطے کی حالت بھی بالکل نہ بدل گئی تھی۔ کار سے اترتے ہوئے میں لرز سا گیا۔ "اندر چلنا ہے کیا۔"

"ہاں بھئی تھوڑی دیر یہاں آرام کریں گے اور اس کے بعد گھر جائیں گے۔ آج تم میرے مہمان رہو گے۔" میرے لنگوٹیے یار نے گاڑی بند کرتے ہوئے کہا اور میری نگاہیں تڑپ کر اس بورڈ کو ڈھونڈنے لگیں جس پر بچپن میں ہم نے پڑھا تھا۔ "ہندوستانی اور کتے اندر نہیں لائے جا سکتے۔" اور پھر مجھے یاد آگیا کہ وہ بنڈ کی طرف کے دروازے پر آویزاں رہتا تھا۔ شاید اب بھی آویزاں ہو۔ نہ معلوم کیوں اس بورڈ کو دیکھنے کی خواہش میرے دل میں مچلنے لگی۔

امرسنگھ کلب کا ہال دودھیا قمقموں کی روشنی میں پھیکا سا لگ رہا تھا۔ فرنیچر شاید اچھا تھا، قالین بھی شاید نیا تھا۔ لیکن مدھم روشنی میں بالکل نہ ابھر رہا تھا۔ دیواروں پر کیا گیا پیلا ڈسٹمپر مٹیالا لگ رہا تھا۔ کمرے میں عجیب سی بو مسلط تھی۔ جیسے اس بلڈنگ کا بدن کبھی نہ دھویا گیا ہو لیکن ہال کی وسعت اتنی تھی کہ اس کی ہیبتناک لمبائی چوڑائی میں مجھے اپنا آپ ایک حقیر کیڑے کے مانند لگ رہا تھا۔ ہال کی محرابیں آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں اس بھیانک خلا میں، داخل ہونے سے ہچکچایا۔ میرے بچپن کے لنگوٹیے یار نے جوتوں کی گرد بے نیازی سے قیمتی قالین پر ہی جھاڑنی شروع کی۔ شہہ پا کر میرے حوصلے نے بھی

اُس کی تقلید کی۔

میرا کئی شخصیتوں سے تعارف ہوا۔ کوئی انجینئر تھا تو کوئی ٹھیکدار کوئی سیکریٹری تھا تو کوئی بیوپاری۔ کسی نے میرے کوٹ کو جانچا۔ کسی نے میرے بے رنگ پتلون کو پرکھا۔ کوئی میرے عریاں گلے میں ٹائی کی پھانسی کو ڈھونڈتا پھرا اور کسی نے میرے گھسے پرانے جوتوں پر ہی نظرِ التفات کی۔ مجھے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ بچپن کے لنگوٹیے یار کی آواز غیبی سہارا ثابت ہوئی۔

"کافی پیو گے یا وہسکی" یار کے لہجے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ تھی جیسے پوچھ رہا ہو کافی پیو گے یا پانی۔

"وہسکی" میرے مُنہ سے نکل گیا۔ گو میں کبھی کبھار ہی شراب پیتا تھا۔ ہچکچا ہچکچا کے، ڈر ڈر کے، چوری چوری، لوگوں سے چھُپ چھُپ رات کے اندھیرے میں دوستوں کے از حد اصرار پر پی ہی لیتا تھا۔ لیکن اس بلڈنگ کے بوڑھے چوکھٹے میں کمتری کا احساس اتنا شدید ہوا کہ دہکتے لاوے کے سوائے میرے سُن وجود کو حرکت دینی دشوار تھی۔

"تو آؤ ناچ کمرے میں پئیں گے۔ وہاں زیادہ لطف ملے گا۔" میرے بچپن کے لنگوٹیے یار نے کہا اور میں بڑے ہال کی بھیانک خلاؤں سے چھٹکارا پانے کے لئے اُس کے ساتھ قدم ملانے لگا۔

ناچ کمرے میں لوگ ناچ رہے تھے۔ در و دیوار ناچ رہے تھے فضا ناچ رہی تھی۔ جیسے زندگی بذات خود ناچ رہی ہو۔ جوان

جسموں کا لمس نقرئی قہقہے، حسین انگڑائیاں پینے کی مخصوص مہک..... میرا سر چکرانے لگا۔ آرکسٹرا کی موسیقی میٹھے زہر کی طرح میری رگ رگ میں سرایت کر رہی تھی۔ میری رگ رگ کو مدہوش کر رہی تھی۔

"ناچو گے" میرے دوست نے پوچھا۔

"آ... ہاں.... نہیں نہیں" میں خوامخواہ ہی کہہ گیا۔ زندگی اتنی جوان ہوتی ہے اتنی خوبصورت ہوتی ہے، اتنی بے قرار ہوتی ہے میرے وہم و گمان نہ تھا۔

"تم زندگی تک کیسے پہنچ پائے یار" میری آواز رشک کے مارے کانپ رہی تھی۔

"پہنچنا کون سی بڑی بات ہے۔ دو چار قلانچیں بھر لیں اور پہنچ گیا" دوست نے وسکی کا گلاس حلق میں انڈیلتے ہوئے سمجھایا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں" بہکنے کے باوجود میرا ہاتھ گلاس کی طرف بڑھتا رہا۔ واٹ 69 کی بوتل سامنے ہو تو بہکتا ہاتھ بھی نہیں بہک سکتا۔ جبکہ میرے ہاتھ دیسی ٹھرے سے اونچی چیز کو کبھی نہ چھو پائے تھے۔

"تم سمجھے ہوتے تو کبھی کے پہنچ گئے ہوتے" اُس نے اپنا گلاس بھر کر بوتل کو میرے سامنے ایسے کھڑا کیا جیسے ترغیب دے رہا ہو کہ حوصلہ ہو تو آگے بڑھو۔ میری رگوں میں زندگی کی رفتار کچھ کچھ تیز ہو رہی تھی اور میں نے تیزی سے کہا:

"پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ مختصر کہہ دو میرے بچپن کے لنگوٹیے یار۔"

اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں وہسکی کی چسکیاں ہلکے ہلکے لے رہا تھا جیسے کوئی بچہ برفی کی ڈلی کو کھانے کی بجائے صرف چاٹتا پھرے کہ کہیں ختم نہ ہو۔ میرے یار نے گلاس اُٹھایا۔ سر کو پیچھے کی طرف پھینکا سارا گلاس ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیل کر پی گیا اور میں شرمندہ سا ہوا۔ شاید مجھے وہسکی پینے کی تمیز نہ تھی۔

"جیسے تم گھبرا گھبرا کے وہسکی پی رہے ہو۔ ویسے تم زندگی کو بھی گھبرا گھبرا کر بسر کر رہے ہو۔" یار مجھے زیادہ پینے کی عادت نہیں" میں نے جھینپ کر کہا۔

"تمہید چھوڑ دو اور صرف یہ بتاؤ کہ یہاں تک کیسے پہنچ پائے؟"

"بڑے کوڑ مغز ہو یار۔ سُننا ہے تو سُنا ہی دیتا ہوں۔ مہاراجہ کو پیچھے دھکیلنے کے بعد حکومت تو کسی کے ہاتھ آنی ہی تھی۔ محلہ محلہ محاذ بنے اُمیدوار چُنے گئے۔ عوامی امیدوار...... ہمارے محلے میں بھی چناؤ ہوا۔ تم شاید گھر والوں کے ساتھ قبائلیوں کے ڈر سے دہلی بھاگ گئے تھے۔ کس کی مجال تھی کہ میرے سامنے میرے محلے میں کوئی میرے سامنے ٹکتا۔ کچھ دھمکیاں کچھ مار پیٹ، تھوڑا سا خون خرابہ ضرور ہوا اور میں محلہ پریذیڈنٹ بنا۔" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ ناچتے ناچتے ایک جوڑا ہمارے میز کے قریب آگیا تھا۔ میرے یار نے لڑکی کو آنکھ ماری۔ میں گھبرا گیا۔ لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"ارے گھبرا گئے۔ یار نے میری گھبراہٹ پر ہنس کر کہا۔ گھبراؤ نہیں میرے دوست۔ یہاں کا ماحول ہر بندش سے آزاد ہے۔ ہر رسم سے بے نیاز ہے۔

ہر آداب سے بے پرواہ ہے۔ تمہارے جی میں جو آئے کر سکتے ہو۔ لوگ آزادی کے پیچھے سرگرداں ہیں۔ کبھی ہندوستان چاہتے ہیں تو کبھی پاکستان۔ لیکن اصل میں ہر کوئی شخص کسی نہ کسی نظام کی بندش کا متلاشی ہے لیکن اس ماحول میں کوئی بندش نہیں۔ کوئی حد نہیں۔ کوئی نظام نہیں۔ یہاں تم کوئی بھی حرکت کسی بھی وقت کر سکتے ہو بشرطیکہ تم میں ہمت ہو، ارادہ ہو، طاقت ہو۔ نہیں یہاں کوئی روک نہیں سکتا...... روک نہیں سکتا...... روک نہیں سکتا......

مجھے محسوس ہوا کہ دوست کے الفاظ آرکسٹرا کی دھن پر زیر و بم کر رہے ہیں۔ شاید یہ وہسکی کا اثر تھا۔

"اپنی سناؤ یار، اپنی سناؤ۔ لیکچر ہزاروں سنے ہیں تم صرف اپنی سناؤ... اپنی سناؤ... اپنی سناؤ...." میں دہراتا گیا اور تب مجھے محسوس ہوا کہ میری آواز بھی آرکسٹرا کی دھن پر بہک رہی ہے۔

"نانا لیکچر برا نہیں۔ لیکچر دیتے لیڈر بن گیا۔ کچھ اور لیکچر جھاڑے ٹھیکیدار بن گیا۔ سرمایہ دار بن گیا۔ اب تو کبھی کبھار ہی لیکچر دیتا ہوں۔ الیکشن کے بعد منسٹر بن جاؤں گا۔ منسٹر! مالک بن جاؤں گا اس ملک کا..... لو ایک اور جام لیکچر کے نام۔" "بڑے خوش قسمت ہو یار" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"خوش قسمت نہ کہو۔ آزاد کہو آزاد۔ ہر دکھ ہر غم سے آزاد۔ پنچھی کی طرح آزاد۔ آزاد خلاؤں کا آزاد پنچھی۔ چلو گھر چلو۔ تمہیں اپنا نیا بنگلہ دکھا دوں۔ کھانا وہیں کھائیں گے۔ تم روز روز تھوڑے ہی میری کار سے ٹکرا جاؤ گے۔"

اس نے بوتل کو گلاس میں نچوڑتے ہوئے کہا۔

نشے میں مدہوش نہ ہی میں نے بنگلے کا حدود اربعہ جاننے کی کوشش کی نہ ہی میرے یار کو مجھے بنگلہ دکھانے کی سُدھ بُدھ تھی۔ کار کو پورٹیکو میں ہی چھوڑ کر ہم ایک دوسرے کے بازو میں بازو پھنسا کر اندر گھس گئے۔ سامنے شاید ڈرائنگ روم تھا چاروں طرف رنگ برنگے صوفے میز اور تپائیاں بکھری پڑی تھیں۔ جن کے بیچ راہ طے کرنا ناممکن تو نہیں مشکل ضرور تھا۔ ہم دونوں رک گئے دروازے کے عین سامنے صوفے پر بیٹھی کوئی خاتون ہمیں گھور رہی تھی۔ خاتون اتنی خوبصورت تھی کہ میں لڑکھڑا سا گیا۔ دوست کے بازو کا سہارا میسر نہ ہوتا تو شاید دروازے پر ہی ڈھیر ہو گیا ہوتا۔

"ارے تم ڈارلنگ" میرے دوست نے میری لڑکھڑاہٹ کو سنبھالتے ہوئے کہا" یہ....... یہ میرے بچپن کا یار ہے۔ لنگوٹیا یار۔ سمجھی۔ کھانا یہیں کھائیں گے۔" غیرارادی طور پر میرے ہاتھ نمستے کرنے کی خاطر بڑھنے چاہئیں لیکن دوست نے بازو آزاد نہ کیا۔ اور جب تک میں اپنا بازو چھڑا لوں دیوی کہیں صوفوں تپائیوں کے بیچ گم ہو گئی۔ میں اپنے لنگوٹیے یار پر برس پڑا۔

"عجیب گھن چکر ہو بھئی۔ شادی کر لی اور کہا تک نہیں۔ اس حالت میں دیکھ کر بھابھی کیا سوچتی ہو گی۔"

"بھابھی کون بھابھی.... کس کی بھابھی..... میری شادی ابھی نہیں ہوئی ہے یار۔" "تو پھر... پھر یہ کون تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے تمہاری کوئی بہن

بھی۔ کتنی"۔ میں نے بمشکل ذہن پر زور دے کر کہا۔

"اپنی بہن کہاں تھی یار! نہ کوئی بھائی۔ اکیلے نے اور اکیلے جائیں گے۔"

دوست دھم سے صوفے پر گر گیا۔ "یہ ایک بڑے پارٹی کی دختر نیک اختر ہے۔ ان کو مجھ سے عشق ہے اس لئے میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

"اتنی رات گئے..... اکیلی... تمہارے مکان میں۔" میں بھی صوفے پر بیٹھ جانے کے لئے مجبور ہو گیا۔

"اُفوہ یار کہا نا تم سے..... کہ اس ماحول میں ہر کوئی آزاد ہے۔ مرد بھی آزاد ہے اور عورت بھی۔ کوئی کسی کو کسی کے پیچھے پھرنے سے روک نہیں سکتا۔ کلب، ڈانس، وسکی، پیسہ، مکان، کارخانے، ٹھیکے، زندگی اتنی بھری پڑی ہے کہ کسی رسم کسی رواج کے لئے نہ تو جگہ ہے اور نہ ہی وقت۔ چاہے وہ بیوی ہو، بہن ہو، لڑکی ہو تم کسی بھی وقت کسی کے ساتھ گھوم سکتے ہو۔ ناچ سکتے ہو۔"

"یہ لڑکی کیسی ہے؟" میں نے دھیمے سے کریدا۔

"اچھی ہے" دوست نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "پڑھی لکھی ہے۔ مال دار ہے۔ ماں باپ کی اکلوتی ہے۔"

"تم کو بھی اس لڑکی سے پیار ہے؟" میں نے پوچھا اور مجھے اپنی بیوی کی یاد آئی۔ جو اس مدہوش لمحے اس لمبے چوڑے ملک کے کونے میں کرایہ کے کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ کہ کب اُس کا ساجن کارخانے کے مالک کا کام نپٹا کر واپس لوٹے اور وہ ساجن سے راشن پانی، بچوں کے کپڑے، لتے پر لڑ پڑے۔ شاید نئی ساڑھی کے

تقاضے پر روٹھ بھی جاتے اور رات کو اس کی باہوں کا سہارا لیکر کچھ اور سہانے خواب مستقبل کی خاطر بننے کی کوشش کرے۔

"ہاں بھئی۔ پیار نہ ہوتا تو وہ یوں میری کوٹھی میں بے روک ٹوک گھسنے کی جرأت کیسے کرتی۔"

"تو پھر شادی کر لو نا یار۔" میں نے شہہ دی۔ "بیوی کے بغیر زندگی ادھوری ہوتی ہے یار۔" "شادی۔" میرے دوست نے لیٹے لیٹے ہی سرگوشی کی۔ "شادی، نہیں یار نہیں۔" سرگوشی کے باوجود دوست کے لہجے میں بلا کی تیزی تھی۔

"بھلا کیوں۔ کیا وجہ ہے۔ تمہیں لڑکی سے محبت ہے۔ لڑکی خوبصورت ہے۔ تمہارے آزاد ماحول کی پیداوار ہے اور کیا چاہیئے تمہیں۔"

"اوہ۔ کیسے سمجھاؤں یار..... تمہیں کیسے سمجھاؤں میں۔" دوست کے لہجے کی تیزی ویرانی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ "میں.....میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"لیکن کیوں۔ کس چیز کی کمی ہے تمہارے ہاں۔" میرے منہ سے نکل گیا۔

"میں اس ماحول میں شادی نہ کرسکونگا دوست۔ میں نہیں چاہتا کہ میری ..... میری بیوی میری پہنچ سے باہر ہو۔ میرے پیار سے باہر ہو.... نہیں چاہتا ..... نہیں چاہتا.... میری بیوی آزاد ہو۔"

چشم زدن میں میرا نشہ ہرن ہو گیا۔ جی چاہا کہ یہاں سے بھاگ نکلوں یا منحنی طور نکل جاؤں۔ دیر کر دی تو شاید میں بھی اپنے بچپن کے لنگوٹیئے یار

کے ساتھ ساتھ اس بھیانک خلاء میں اٹک جاؤں گا۔ جس کو پُر کرنے
کے لیے کارخانے، ٹھیکے، امر سنگھ کلب کا احاطہ..... یہ لمبا چوڑا بنگلہ
اور بنگلے میں سرگرداں آزادی کی دیویاں بھی کافی نہ تھے۔

وہ

بارہ بج چکے تھے۔ اس نے کھانا کھا لیا تھا۔ ماں کمیٹی کے نل پر برتن دھونے گئی تھی۔ اور وہ گھر میں اکیلا تھا۔ لیکن نیند بالکل نہ آرہی تھی۔ نہ معلوم چھابڑی والے کی ہانک، گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ، ہارن کا پوں پوں کیوں جگائے دیتا تھا۔ روز وہ یہ آوازیں سنا کرتا تھا اور روز آوازیں لوریاں بن کر اس کے تھکے بدن کو نیند کی آغوش میں دھکیل دیتی تھیں۔ پر آج نہ معلوم کیوں یہ آوازیں اُس کو جگائے رکھنے پر تلی محسوس ہو رہی تھیں۔ کسی پہلو چین نہ آرہا تھا۔ پھٹے میلے بستر پر وہ کروٹیں بدل بدل کر جھکرا اُٹھا تھا۔

روز اُس کا کام دن کے دو بجے سے شروع ہو کر رات کے دو بجے ختم ہوتا تھا۔ اس لیے رات کی نیند پوری کرنے کے لئے وہ دن کا کھانا کھاتے ہی سو جایا کرتا تھا۔ لیکن آج نیند جان بوجھ کر اُسے شاید چکمہ دینے پر تلی ہوتی تھی۔

ٹوٹے پھوٹے مکان پر حبس مسلط تھا اور باہر آگ برس رہی تھی۔ بدن پانی بن کر بہا جا رہا تھا۔ وہ سو نہیں سکے گا تو رات دو بجے تک کھڑا رہنا مشکل تھا۔ فلم نئی تھی۔ رش بھی زیادہ ہوگا۔ آج شاید دیر سے لوٹنا پڑے۔ فلم غضب

کی ہے۔ مار کٹائی سے بھرپور۔ کل سالے گیٹ کیپر نے پوری فلم دیکھنے نہیں دی۔ واہ کیا کمال کی پکچر ہے۔ اوہ...... کتنے زور سے لڑ رہا تھا ہیرو۔ ہیرو اکیلا ولن کے آٹھ غنڈے...... مار ٹھک...... مار ٹھک...... یاد آتے ہی اس کے اپنے نتھنے پھیلنے لگے۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ بازوؤں میں گھاؤ سے آنے لگا۔ جی چاہا...... ساری دنیا آجائے اور وہ اکیلا...... مار ٹھک...... مار ٹھک...... ٹن...... ارے ساڑھے بارہ بج گئے اور نیند...... یہ سالی نیند

...... بڑھیا نے ناحق صبح صبح جگایا۔ مرتی بھی نہیں......

لیٹے ہی لیٹے اس نے ہاتھ بڑھایا۔ چھٹے تکیے کے نیچے سے کچھ کاغذ نکالے تصویریں تھیں۔ تصویروں کے نیچے جلی حروف میں کچھ شعر چھپے تھے جنہیں وہ دیکھ تو سکتا تھا لیکن پڑھ نہ سکتا تھا۔ یہ خوبصورت تصویریں، شفاف چمکیلے کاغذ پر رنگین پرچھائیاں، امیتابھ بچن، ہیما مالنی، زینت امان...... ان ایکٹروں کے بھی مزے ہیں۔ عیش کر رہے ہیں بیٹھے۔ کبھی ضرور جانا پڑے گا۔ قسمت آزمائی کرنی پڑے گی۔ سنا ہے جانی واکر قلی تھا...... اوہ...... ریکھا...... ہائے...... کاش اس کے پر سے کپڑا ڈھلک جائے اور تھوڑا سا۔ اتنا دکھا کے اور تھوڑا سا۔ ہائے...... اوئی...... میں مرا۔ جذبات کی شدت نے اسے تصویریں سینے سے لگانے پہ مجبور کیا اور وہ تھوڑی ہی دیر میں نیند میں غافل ہو گیا۔

"سالے...... دیر سے کیوں آیا" اس کو لفظ سالے پر کبھی غصہ نہ آتا تھا یہ لفظ وہ روز سننے کا عادی تھا۔ گو اس کی ایک بہن بھی تھی جو کسی دوکاندار کے ساتھ

بھاگ گئی تھی اور وہ خوش ہو گیا تھا۔ حرام زادی گئی۔ ایک پیٹ تو کم ہو گیا۔ پر جب کبھی بیتے زمانے کی یاد اُس کے ذہن میں کھسک آتی تھی تو اُس کے سینے میں ہوک سی اُٹھتی تھی۔ بچپن میں جب کبھی وہ کسی کے ہاتھوں پٹ کے آتا تھا اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے گھر کے کسی اندھیرے کونے میں چپکے چپکے روتا تھا یا آوارہ پھرنے کی وجہ سے ٹانگوں میں اُبھرتی تھکن کی وجہ سے بے حال ہونے لگتا تھا یا ماں غصے میں آکر اس کو بھوکا رکھتی تھی تو ایسے وقت اُس کی بہن اُس کے آنسو پونچھتی تھی۔ پیٹنے والوں کو کوس کوس کر اس کی ڈھارس بندھاتی۔ اُس کی ٹانگیں دباتی اور چوری چھپے اپنے کھانے میں سے اُس کو کھلا دیتی تھی۔ اُس وقت اس کو بہن کے وجود کا ہلکا سا احساس ہو جاتا تھا۔ ویسے وہ دن بھر بہن سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ بہن اس کو گالیاں دیتی رہتی تھی۔ اور آخر میں بڑھیا دونوں کو پیٹ پیٹ کر ادھ موا کر دیتی تھی۔

پر اس وقت.... سالے کا لفظ.... فلم کا ہیرو اکیلا ولن کے آٹھ غنڈے اور پوسٹر پر مکا تانے جوکر اُس کا منہ چڑھانے لگا۔ اپنی کمزوری کو جھٹلانے کے لئے وہ برف کی سل کو زور زور سے توڑنے لگا۔

لیمن اور اورینج کی بوتلیں۔ رنگین لاشیں تیار کھڑی تھیں۔ پانوں پر خون بکھرا گیا تھا اور سُرخ بھیگا کپڑا خوامخواہ کفن سا لگ رہا تھا۔ جھلکتی چاندی کے پنوں میں ملبوث سگریٹ.... مختلف قسم کی ڈبیوں سے نکالے گئے سگریٹ...... چاندی کے پنے اور سگریٹ کی ڈبیوں کے خول ردی کے

ڈھیر پر پھینکے گئے تھے۔ اور بکھرے سے بے ترتیب سگریٹ ننگے عریاں ایک جیسے

لگ رہے تھے شاید سب آدمی بھی...... سوٹ پہنے نوجوان انڈیا کنگ

کے دو سگریٹ مانگ رہا تھا۔ دو ہی کیوں بیس کی ڈبی کیوں نہیں۔ شاید ناواقف

...... پھر انڈیا کنگ کے سگریٹ کیوں..... چار مینار کیوں نہیں........

نہیں اتنا گیا گذرا نہیں۔ پتلون پر رفو کا داغ عیاں سہی، کہیں بابو ہوگا کسی دفتر

میں۔ لیجئے صاحب..... دو سگریٹ انڈیا کنگ...... جی حضور.... پان بھی

تیار ہے جناب۔ اے ٹھہر۔ بکتا جا رہا ہے۔ ایک ڈبی لیمپ سگریٹ، جیسے تمہارے

باپ کے نوکر ہیں..... جی ہاں۔ اصلی بنارسی صاحب..... باقی کے پیسے یہ۔ آپ کا

خادم حضور..... دے دے ڈبی لیمپ سگریٹ.... پیسے دیتے نا.... جا بک بک

مت کر۔ بھک منگا کہیں کا۔ ہونہہ.... کوکا کولا.... ہاں صاحب، برف میں لگی ہوگی

اس کی پیٹھ میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا۔ کچھ دنوں سے یہ بیماری اُسے

چپک سی گئی تھی۔ شاید لگاتار کھڑے رہنے کی وجہ سے..... درد کی شدت سے

مجبور ہو کر اُس نے پیٹھ دکان کے چھجے سے ٹیکنی چاہی۔

"ابے برف اور تو ڑ لا....."

موٹی توند کو دیکھ کر اُس کے وجود میں عجیب سی خواہش اُبھر آتی تھی

جی چاہتا تھا کہ موٹی توند کو ہاتھوں میں تول کر زور سے لات مارے اور توند

فٹ بال کی طرح.... اوئی.... ہاتھ ہی کٹ گیا نا توند کو لات مارتے وقت

صرف توند کا خیال رکھو۔ پھر شاید اپنے ہاتھ زخمی نہ ہوں، ویسے یہ خون پانی

پر پھیرے گئے سُرخی سے زیادہ سُرخ نہیں۔ دیکھ بھی کون سکتا ہے۔ شاید لالہ جی .... لالہ تو روپے کا نوٹ دے رہا ہے۔ کرکرے نوٹ.... چاندی کے روپے...... سگریٹ کے پنّے.... زیادہ خوبصورت......

ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ فلم شروع ہو رہی ہے۔ زندگی کا کھیل یا زندگی کی پرچھائیاں یا شاید زندگی کا مذاق۔ دوکان میں مال ہوگا۔ لوگ آئیں گے۔ دکان میں مال نہیں ہوگا لوگ نہیں آئیں گے۔ سینما میں فلم ہوگی لوگ آئیں گے سینما میں فلم نہیں ہوگی لوگ نہیں آئیں گے۔ خالی دکان اور سوکھے بازو.... کون پوچھے گا.... ماں بھی تو مر نہیں جاتی بڑھیا.... ہوں!

آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ بدن پسینے سے تر ہو گیا تھا اور گلا بُری طرح سے سوکھ رہا تھا۔ سامنے ICEBOX تھا۔ رنگین بوتلیں سجی تھیں اور وہ پانی کے ڈرم میں سے گرم پانی کا گلاس غٹاغٹ پی گیا۔

"کتنی بوتلیں بیچی تم نے" لالہ ضرور پوچھ لیتا تھا۔ گو جب بھی وہ کسی گاہک کو کچھ بیچ دیتا تھا تو لالہ اُسے جانچتا رہتا تھا۔ پھر بھی شک لالہ کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ اس لئے اس کو اپنی ہر حرکت کا حساب دینا پڑتا تھا۔

"لالہ جی.... چار بوتل لیمن.... دو اور بیچ، سگریٹوں کے پیسے ساتھ ساتھ تجوری میں ڈال دیئے۔ باقی کے پیسے رہے.... نہیں لالہ جی.... جنجر.... ایک بوتل بھی نہیں۔ اللہ قسم.... جھوٹ نہیں بولتا۔ دیکھ لو جیب میں.... آپ بھی بس لالہ جی.... اوہ پھنس گئی تھی یہ اٹھنی سالی۔ جیب اندر سے پھٹی

ہے..... نہیں لالہ جی۔ میں جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔ اللہ قسم۔

آج بھی لالہ نے اُسے پکڑ لیا تھا۔ سوچا تھا ایک پلیٹ آلو چھولے کھاتے اور دہی کی لسی۔ سُنا ہے دہی بڑی اچھی چیز ہے۔ گرمیوں میں منوں پی جاؤ اور چھولے بہت طاقتور۔ سیروں خون پیدا کرتے ہیں۔ گھوڑوں کو روز کھلاتے ہیں۔ تبھی تو دن بھر دوڑتے رہتے ہیں اور اُس کے اپنے سوکھے بازو پیاز کے ساتھ سوکھی روٹی..... لالہ بڑا حرام زادہ ہے۔ ارے.....

میں تو بھول ہی گیا۔ لالہ جی میں ذرا ہال کے اندر کسی کو لیمن کسی کو سوڈا.....

نہیں لالہ جی میں فلم نہیں دیکھتا۔ کیا رکھا ہے ان تھرڈ کلاس فلموں میں۔ آپ بھی لالہ جی بس۔ انٹرول میں آپ کی مرضی۔ تو ذرا لالہ جی ایک بیڑی۔ واہ مزا آگیا۔ میں نے کہا لالہ جی سگریٹوں میں وہ مزا کہاں جو بیڑی میں۔

انٹرول کی گھنٹی جھنجھنا اُٹھی۔ ہال کے دروازے کھل گئے۔ اُس نے ایک ہاتھ میں سوڈے کی بوتلوں کا بکس اُٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں گلاسوں کا بکس۔ باہر نکلتے فلم بینوں کی پرواہ کئے بغیر وہ لڑتا جھگڑتا اندر چلا گیا۔ اندر ملگجے میں اُس نے ہال کا جائزہ لیا۔ اُس کے کلاس کی چوتھی قطار میں دوسری دکان کا نوکر نظر آیا۔ اُس کا خون کھول اُٹھا۔

اچھا تم ہو سالے..... خیر نپٹ لونگا تم سے باہر..... دیکھ آج دس بوتلیں نہ بیچ آوں تب کہنا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ میرا کلاس ہے..... ہاں صاحب لیمن یا اورنج۔ جی ہاں برف میں لگی ہوئی۔ چار لیمن یہ لیجئے صاحب۔

برف سے بھی ٹھنڈی۔ صرف چار روپے.... زیادہ نہیں مانگتا حضور....

اوہ..... انگلی حرام زادی بھر درد کر رہی ہے۔ لیمن اور ینج... ہائے میں مرا۔ ...... اتنی خوبصورت.... گوری بھی۔ کانوں میں جھمکے۔ کاش سالی بلالے، کچھ تو مانگ لے، قسم اللہ کی جو ایک پیسہ بھی لوں۔ غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ اُلجھے بالوں کو سلجھانے کی خاطر بڑھا۔ لیکن ہاتھوں میں بوتلوں اور گلاسوں کا خیال آتے ہی رک گیا۔

لیمن.... نہیں۔ تو پھر اورینج.... نہیں..... ہائے انکار ہی سہی پر کتنی میٹھی آواز..... جھنجھناتے گھنگرو یا بانسری کی تان۔ کس ادا سے دیکھ رہی ہے سالی۔ میری طرف..... یہ شاید..... ہوں کالج کا لونڈا........ حرام زادہ..... دوسروں کی بہو بیٹیاں..... بلا رہا ہے سالا۔ لڑکیوں پر رعب ڈالنے کے لئے۔ وہ نہیں جاتا لیکن دوسری دکان کے نوکر کو للکارا تھا اُس نے..... دس بوتلیں بیچنی نہیں اُسے۔ عزت کا سوال تھا۔ لو لیمن... ایک روپیہ..... ٹوٹا نہیں ہے دس کا۔ لادونگا۔ ہیما مالنی ہے کیا۔ فلمی دُنیا میں جانا ہے تو اس حرام زادی کے ساتھ..... یہ بھی تو حسین سہارا..... جاتے ہی ہیرو کا پارٹ ملے۔ پر کیسے، کیونکر.... صراحی دار گردن اور زخمی کھردرے ہاتھ۔ پھٹی داغدار قمیض اور بیل باٹم پہنے کالج کا چھوکرا.... کاش..... یہ لو نو روپے۔ پھینکوں نہیں تو کیا جیب میں ڈال دوں۔ چپ رہو، تمیز کا بچہ۔ ٹوٹا لایا ہوں پیسے چکاؤ۔ اسی ٹائی سے پھانسی نہ

نہ لگا دوں تو ..... گیٹ کیپر بار .... تم بھی ناحق ..... گالی دی اس سالے نے .... سوٹ پہن کر اپنے آپ کو لاٹ صاحب سمجھتا ہے۔

بتیاں بُجھ گئیں اور اس کا غصہ بھی بُجھ گیا۔

پہلا شو ...... رنگین بوتلیں ..... سگریٹ کے پنے ..... جھلملاتے جھمکے .... دوسرا شو ..... زخمی ہاتھ .... تھکی کمر .... پوسٹر پر مکا تلنے جوکر .... آخری شو ...... بند تجوری ..... سوکھے بازو اور سوکھی روٹی ......

ماں بھی تو ...... مر بھی تو نہیں جاتی۔!

مذہب

لمحہ بھر کے لئے ٹھیکہ دار دفتر سے ملحق باغ میں کھڑے قد آدم پودوں کی آڑ میں کھو گیا اور اس نے اس لمحے کو غنیمت جان کر میز پر سے ٹھیکہ دار کی بل چن کر میز کی دراز میں چھپا دی۔ ٹھیکہ دار سے منسلک جو بھی کوئی کاغذ اس کے پاس آجاتا تھا، پھنکار مارتے سانپ کی مانند لگتا تھا۔ ویسے اس دفتر میں ہر کاغذ زہریلے سانپ کا رتبہ حاصل کر گیا تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی سے چھوؤ تو کاٹ کھائے۔

کئی بار اُس نے یہ نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کوئی افسری تو تھی نہیں جو اس نوکری سے چپکا رہنے کی کوشش کرتا۔ یوں تو سب اس کی عزت کرتے تھے۔ "پنڈت جی" کے بھاری بھرکم نام سے بھی نوازتے تھے۔ لیکن وہ جان گیا تھا کہ بابو جی کہنے کی بجائے پنڈت جی کہنے میں کس قسم کا طنز کار فرما تھا۔ اس دفتر کا بڑا آفیسر "ایس، ڈی، او" پانچ وقت کا نمازی تھا۔ جتنے چھوٹے بڑے ٹھیکہ دار اس دفتر سے منسلک تھے سب کے سب مسلمان تھے۔ صرف ایک سردار جی کے بغیر اور سردار جی کو کبھی کبھار

ہی ٹھیکہ ملا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ دفتر کا چپراسی بھی مسلمان تھا۔ ان سب کے بیچ وہ واحد ہندو تھا۔

کوئی وقت تھا جب رشتہ داروں اور جان پہچان والوں کو اُس کی قسمت پر رشک آگیا تھا۔ اور وہ اپنی قسمت پر خود بھی رشک کرنے لگا تھا۔ اُس کا تقرر ایک ایسے محکمے میں ہوا تھا جہاں ہر جنبش دولت تھی، ہر کروٹ کرنسی نوٹ اور ہر ٹھوکر روپیوں کا ڈھیر۔ اس لئے جب سے دفتر کا چارج اُس کی تحویل میں آیا اُس کا ذہن غیر ارادی طور پہ دولت کا متلاشی رہا۔ یہ ٹھیک تھا کہ روز کچھ بالائی آمدن ہوتی تھی جس میں اس کے چلتے پانی کا خرچ نکل آتا تھا لیکن اتنے کم پیسوں سے اُس کی عمر بھر کی تشنہ امیدیں سیراب ہونی ناممکن تھیں۔ بڑی بہن کی شادی، بوڑھے ماں باپ کا خرچہ اور خاندانی کھنڈر کی مرمت۔ بھائی کی زندگی بھی سنوارنی تھی۔ اتنی ساری امیدوں کو پورا کرنے کے لئے ڈھیر سارے روپیوں کی ضرورت تھی ضرورت نے اُس کو ہر جنبش ہر کروٹ کو نظر انداز کر کے براہ راست ٹھوکر کھانے پر آمادہ کیا۔ سوچا! خود ہی ٹھوکر کھائے اور خود ہی ڈھیر سارے روپے حاصل کرے۔ چپراسی کی نصیحت پر اُس نے ٹھیکہ دار سے مل کر ٹھیکہ دار کی بل میں ایک معمولی سا صفر بڑھا کر ٹھوکر تو کھائی لیکن ڈھیر سارے روپے نہ پائے۔ روپے کے لالچ میں وہ ایک انوٹ حقیقت بھلا بیٹھا۔ وہ ہندو تھا اور اس کا آفیسر مسلمان۔

ایس، ڈی، او بل دیکھ کر گرج پڑا تھا۔

" او پنڈت کے بچے، یہی بدلہ دے رہو میری مہربانیوں کا۔ کیا میں تمہاری بے ایمانی کی تصدیق کر کے اپنے ہاتھ کٹوالوں۔ ہتھکڑیاں ڈال کر جیل نہ بھجواؤں تو...... چور.... اُچکا....."

وہ تو شکر تھا پرماتما کا کہ سِکھ ٹھیکہ دار موقعہ پر موجود تھا جس نے اس کی کم سِنی اور ناتجربہ کاری کا واسطہ دیکر ایس، ڈی، او کو غلطی نظرانداز کرنے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ اس کی زندگی برباد ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی۔ ٹھیکہ دار نے سب تصور اس کے سرمنڈھ کر اپنا آپ بچا لیا۔ حد تو یہ تھی کہ دفتر کے چپراسی نے بھی اپنی لاعلمی ظاہر کر کے ٹھیکہ دار کی بات رکھ لی تھی۔

روپیوں کے ڈھیر نہ سہی لیکن اس ایک ٹھوکر نے اس کو زندگی کے ڈھیر سارے راز سمجھا دیئے۔ وہ جان گیا کہ دفتر کے لوگ اس کو غیر مذہب کا ہونے کے ناطے اس کا وجود دفتر میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بس چلے تو ابھی اس کو دفتر سے چلتا کریں۔ اس کی روزی چھین لیں۔ اس کو بھوکوں ماریں۔ صرف ایک صفر بڑھایا تھا اس نے بل میں۔ کسی کا خون تو نہیں کیا تھا۔ اور شاید صفر روز ہی بڑھا دیئے جاتے ہیں ورنہ ایس ڈی او کی شہر میں شاندار کوٹھی نہیں ہوتی۔ اس کا صاحبزادہ سکوٹر پہ دندناتا نہ پھرتا۔ صرف دکھاوے کے لئے ایس، ڈی، او سلائی

اُکھڑنے اور ایڑھیاں گھسنے کے باوجود نیا جوتا نہ خریدتا تھا۔ ڈر گیا ہوگا سالا کہ کہیں کسی بہانے دفتر میں پولیس وارد ہوگئی تو باقی سب دھاندلیاں افشا ہونے کا خطرہ تھا۔ سردار ٹھیکہ دار کی بات رکھ کر اپنے آپ کو رحم دل ثابت کر رہا ہے۔ سالا..... حرام زادہ..... اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتا ہے۔ خیر وہ خود بھی کسی سے کم عقلمند نہیں۔ روپیہ تو روپیہ سگریٹ بھی نہ لے گا کسی سے بلکہ پکّا ایماندار بن کر ان بے ایمانوں کے بیچ کانٹا بن کر کھٹکتا رہے گا۔ اپنے ارادوں کو تقویت دینے کے لئے اُس نے زندگی میں پہلی بار پوجا پاٹ کرنا اور ٹیکا لگانا شروع کیا۔

"آداب عرض پنڈت جی..... سگریٹ لیجئے۔"

ٹھیکہ دار کی آواز نے اُسے چونکا دیا اور وہ چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ شاید آج ٹھیکہ دار نئے حربے سے لیس ہو کر آیا تھا۔ ورنہ اصلی گولڈ فلیک سگریٹ اتنی بے دردی سے نہ لٹاتا پھرتا۔ اُس کے جی میں آیا کہ سگریٹ پینے سے انکار کر دے۔ اصول بنایا تھا اُس نے ایمانداری کا۔ لیکن دو ٹکے کے چپراسی کو بھی ٹھیکہ دار کا اصلی گولڈ فلیک کا سگریٹ جلاتے دیکھ کر اُس کا فیصلہ ڈانواڈول ہوگیا۔ سگریٹ کی طلب بڑھ گئی اور اس کے جیب میں آج کوئی سگریٹ نہ تھی۔ اور تب اس کو یہ بھی یاد آیا کہ ڈیرے پر آج چاول بھی نہیں ہیں اور نا ہی چاول خریدنے کے لئے پیسے ہیں۔ تنخواہ کا بڑا حصّہ گھر بھیجنا پڑتا تھا۔ اس کا بس چلے تو دفتر کے سارے عملے کی تنخواہ گھر بھیج دے تاکہ اس کا

چھوٹا بھائی خوب پڑھ لکھ سکے اور کسی ریشن درازالیں، ڈی او کا ورک چارج کلرک نہ بن جائے جہاں بالائی آمدن کے بجائے ڈانٹ پھٹکار سننی پڑتی ہے پھبتیاں سُننی پڑتی ہے اور مہینے کے آخری دنوں میں بھوکا رہنا پڑتا ہے۔

بھوک کا خیال آتے ہی اس کو بے انتہا بھوک محسوس ہونے لگی "پنڈت جی ماچس" اس نے اصلی گولڈ فلیک کی سگریٹ سلگائی اور بھوک کی ٹیس کو دھوئیں کے کڑوے مرغولوں میں جذب کرنے لگا۔

"آج صبح صبح کیسے بھول پڑے ٹھیکہ دار صاحب" وہ جان بوجھ کر ٹھیکہ دار کو ٹھیکہ دار صاحب کے نام سے پکارتا تھا۔ گو اس کو معلوم تھا کہ ٹھیکہ دار دو دفعہ حج کر کے آیا تھا اور جو کوئی مسلمان حج کر کے آتا ہے لوگ تعظیماً اس کو حاجی صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔

"مارچ کے آخری دن ہیں پنڈت جی سال ختم ہو رہا ہے اور بل ایسے ہی پڑا ہے۔ کیا صاحب نے بل دیکھ لیا۔" ٹھیکہ دار صاحب جب تک صاحب خود کاغذات کا مطالبہ نہ کرے میں اپنی طرف سے کوئی کاغذ صاحب کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ ایک دفعہ زک اٹھا چکا ہوں۔" اس نے لاپرواہی ظاہر کی۔

"اوہ...... وہ صفر والی بات......" ٹھیکہ دار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور وہ جل ہی تو گیا۔ ٹھیکہ دار کے لئے ایسا واقعہ کھیل سہی پر اس کے لئے تو زندگی اور موت کا سوال بن گیا تھا۔

"آہستہ ٹھیکہ دار صاحب.... آہستہ" وہ بے قابو ہو کر چیخ پڑا۔

"صاحب کمرے میں عبادت کر رہا ہے۔"

روکنے کو تو اُس نے ٹھیکہ دار کو روک لیا لیکن دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ اے کاش وہ بھی کھِلکھلا کر ہنس سکے۔ صدیاں جیسے بیت گئی تھیں کھِلکھلا کر ہنسنے کی۔ یہ سارا مکان دفتر کے لئے مخصوص تھا۔ بظاہر دفتر کے نزدیک رہنے لیکن اصل میں مکان کا کرایہ بچانے کے لئے ایس ڈی او اندر والے حصے میں رہائش پذیر تھا۔ آفیسر کی قربت نے اس کی ہر حرکت پر پابندی سی لگا دی تھی، نہ وہ اونچا بول سکتا تھا اور نہ ہی دل کھول کر بات کر سکتا تھا۔ ہنسنا تو کجا، مسکراہٹ پر بھی پابندی عاید تھی۔ حتیٰ کہ دن بھر کرسی پر بیٹھے رہنے کی وجہ سے بدن میں اُبھرتی تھکن کو دُور کرنے کے لئے باہر لان میں ٹہل بھی نہ سکتا تھا۔ زندگی جیسے اس چار دیواری میں مقید ہو گئی تھی اُس کا بس چلے تو اس مکان کی اینٹ سے اینٹ بجا دے، میز کرسیاں توڑ ڈالے۔ کچھ نہ کر سکے تو کم از کم سامنے اسٹول پہ بیٹھے چپراسی کو ہی اُٹھا کے باہر پھینک دے جو اس کے منع کرنے کے باوجود اس کے روبرو سگریٹ پینے سے باز نہ رہتا تھا۔ چپراسی شاید اس زعم میں تھا کہ بڑا آفیسر ہم مذہب ہونے کے ناطے یہ معمولی کلرک اور وہ بھی غیر مذہب کا کلرک اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا

..... سالا چپراسی..... حرام زادہ چپراسی......

اندر والے دروازے کا پردہ ہٹا اور اس کی سوچ دم توڑ گئی۔

ایس، ڈی، او کمرے میں وارد ہوا۔ بڑبڑا کر اُس نے ادھ جلا سگریٹ جلدی سے جوتے کے نیچے مسل دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"حاجی صاحب کے کاغذ لے آو" ایس، ڈی، او نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی حکم جھاڑ دیا۔

اُس نے ٹھیکہ دار کا بل میز کی دراز سے نکال دیا اور خود ہی چل کر ایس، ڈی، او کے سامنے میز پر پھیلا دیا۔ چپراسی افسر کو دیکھتے ہی سگریٹ چھپا کر باہر برآمدے میں بھاگ گیا تھا۔

"سب کاغذ ٹھیک ہیں" ایس، ڈی، او نے ایسے پوچھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کہیں آج بھی تو کوئی بے ایمانی نہیں برتی۔ اُس کے کان کی لوئیں سُرخ ہو گئیں۔ جی چاہا کہہ دے کہ تم کس مرض کی دوا ہو۔ بڑے افسر ہو خود جانچ پڑتال کر دو لیکن وہ جھگڑا کر کے ان لوگوں کو کوئی موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا اپنے آپ پر جبر کرنا ہی عقلمندی تھی۔

"سب ٹھیک ہے۔ آپ .... آپ چیک کر لیجیے۔" اُس نے دھیمے سے کہا۔

"حاجی صاحب... کرلوں دستخط بل پر..... فائینل بل ہے" ایس، ڈی، او نے قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ "جانتا ہوں حضور... آپ ہی کی دیر ہے۔" ٹھیکیدار نے جواب دیا اور واسکٹ کی جیب سے دس دس روپے کے کرنسی نوٹوں کا ایک بڑا سا بنڈل نکال کر ایس ڈی او کے سامنے میز پر

ادب سے رکھ دیا۔

اس کا سارا بدن کانپ اُٹھا۔ ہاتھ پیروں میں جھرجھری ہونے لگی۔ غیرارادی طور پر اُس نے اپنا آپ سکیڑ لیا۔ کیا معلوم نوٹ کا بنڈل اُس کے سر پر لگے یا چہرے پر۔ نہ معلوم آج کس کا منہ دیکھا تھا صبح جو شامت اُس پر کھیل رہی تھی۔ ہے پرماتما.... رکھشا.... رکھشا کرنا اپنے بھگتوں کی۔ اس ٹھیکہ دار کو ہی یم دوت بنا کے بھیجنا تھا کیا۔ اور بد قسمتی کی یہ حد کہ آج سردار جی ٹھیکہ دار بھی دفتر میں موجود نہ تھا۔ کالی میز پر نوٹ چم چم چمک رہے تھے۔ شاید نئے تھے۔ ہزار... دو ہزار.... یا شاید اس سے بھی زیادہ .... اس کا ذہن لڑکھڑانے لگا۔ بے بس ہو کر اُس نے اپنی بے گناہی پیش کرنی چاہی لیکن گلے سے آواز نکلے بھی تو.... جیسے کرنسی نوٹوں کے بنڈل کے گرد بندھا دھاگا اُس کے گلے کے گرد بندھ گیا ہو۔ ٹانگیں ویسے ہی جواب دے رہی تھیں۔

"پورے ہیں...." ایس، ڈی، او نے جیسے اُس کے گلے میں بندھے دھاگے کو جھٹکا دیا، میز کا سہارا نہ ہوتا تو وہ کب کا گر گیا ہوتا۔

"جی حضور.... دستخط کر لیجئے۔ میں بل خود ہی بینک لے جاؤں گا۔" شاید ٹھیکے دار کی آواز تھی۔ گھبراہٹ اتنی شدید طاری تھی کہ اُسے بالکل پتہ نہ چلا کہ کب ایس، ڈی، او نے بل پر دستخط کر دیئے۔ کب نوٹ کا بنڈل اُٹھا کر کمرے میں واپس چلا گیا۔ نہ ہی وہ گھبراہٹ کے زیرِ اثر ٹھیکیدار سے

کچھ پوچھ گچھ کر سکا۔ حتیٰ کہ جاتے ہوئے ٹھیکیدار کے پیش کردہ سگریٹ کو سلگانا بھی بھول گیا۔ ذہن جیسے ماؤف ہو گیا تھا۔

"پنڈت جی....." ایس' ڈی' او کی آواز کسی بھوکے گدھ کی طرح اس کے ماؤف ذہن کو نوچنے لگی اور وہ بلبلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جال پھینکا گیا تھا۔ صرف جال کسنے کی دیر تھی۔ اب شاید وہ اس کرسی پر کبھی نہ بیٹھ سکے گا۔ نہ شاید اس کی بہن کی شادی ہو سکے گی۔ اور نہ ہی اس کا چھوٹا بھائی پڑھ لکھ کر بڑا انجینیر بن سکے گا۔

حسبِ عادت اُس نے سامنے پڑے بکھرے کاغذ یکجا کر لئے۔ قلم اور دوات قرینے سے سجا دی۔ کرسی ٹھیک کر دی۔ پریشان بالوں کو انگلیوں سے سنوارا اور ایک گہری لمبی سانس لی۔ داؤ لگ گیا تھا۔ بے تابو ہونے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اس کو چاہیئے ٹھنڈے دماغ سے حالات کا جائزہ لے اور مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرے۔ یہ ان دو کی جنگ نہیں، بلکہ ان کے ارادوں کی جنگ ہے' ان کے معاشروں کی جنگ ہے یا شاید ان کے مذہبوں کی جنگ ہے۔ اگر ایس' ڈی' او مسلمان ہے تو وہ بھی رام کرشن کی اولاد ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ اُس نے کسی کے آگے جھکنا نہیں سیکھا۔

اس نے کمرے کا پردہ جھٹکے سے ہٹا دیا۔ کیا ضرورت تھی ان پردوں کی۔ پردے تو اُسی دن ہٹ گئے تھے جس دن ایس' ڈی' او نے نقاب نوچ لی تھی اپنے چہرے سے پرماتما کی دیا ساتھ رہے تو وہ آج خود بھی

ت سارے پردے ہٹا کے رکھ دے گا.... نہیں پردوں کی دھجیاں
ڑا کے رکھ دیگا۔ جن پردوں کی آڑ لیکر ایس، ڈی، او پلنگ پر بیٹھا اس کو
ھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

پلنگ کے سامنے تپائی پر نوٹوں کا بنڈل کھلا پڑا تھا اور نوٹ تاش
پتوں کی طرح پھیلے پڑے تھے۔ اس کی ابلتی نگاہیں نوٹوں پر جم کر رہ گئیں
ھیر سارے چاول خریدے جا سکتے ہیں۔ اتنے سارے نوٹوں سے......!

"یہ لو پنڈت جی..... کام آئیں گے۔" ایس، ڈی، او نے دس بیس
ٹ تپائی پر سے اٹھا کر اس کی جانب بڑھا دیئے۔

"جی....." وہ چکرا گیا۔ جال کسا جا رہا تھا۔ کیا معلوم پھر پھڑاتے
ور الجھتا ہی جاتے۔ "لے لو بھئی..... یہ پیسہ حرام کا نہیں.... یہ تو تمہارا
ق ہے۔" ایس، ڈی، او نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بڑی مدت کے بعد
یس، ڈی، او اس کے سامنے مسکرا رہا تھا۔ ورنہ صفر والے حادثہ کے بعد
یس، ڈی، او کی تند کھا جانے والی نگاہیں ہی اس کا سامنا کرتی تھیں۔
ایدجال الجھ رہا تھا یا شاید وہ خود الجھ رہا تھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکا
ون جانے کیا ہو رہا تھا۔

"ڈرو نہیں بھئی..... لے لو....." ایس، ڈی، او نے خود ہی آگے
ھک کر نوٹ اس کے کانپتے ہاتھوں میں ٹھونس دیئے اور اس کو یقین نہ
یا۔ بے اعتبار نگاہیں اپنے ہاتھوں میں پڑے نوٹوں پر رکیں۔ نوٹوں کے

پاس ہی اپنی کلائی پر بندھے مخصوص پوتر رنگین دھاگے پر اُچک گئیں۔ اُچکتے اُچکتے ایس ڈی او کی قمیص کے کھلے کالر کے بیچ دودھیا سینے پر مرکوز ہو گئیں۔ ..دودھیا سینے پر لٹکتے ہوئے تعویذ سے اُلجھ گئیں۔ جس کی سنہری وسعتوں میں تلواریں رقصاں تھیں۔ اُس کا ذہن بھی ڈولنے لگا۔ کاش ایس ڈی او اس کو سنبھلنے دے، سوچنے کی مہلت دے۔ سمجھنے پرکھنے کی۔ ....کاش.... لیکن ایس ڈی او اُس کی پریشانی سے بے نیاز کہتا جا رہا تھا۔

"تم ابھی نئے ہو۔ اس لئے دفتر کے اصولوں سے ناواقف ہو.... یہ پرسنٹیج (— parcentage) ہے جو ہر ٹھیکہ دار کو دفتر کی طرف دینا ہوتی ہے۔ دھیرے دھیرے سیکھ جاؤ گے یہ سب راز۔ لیکن یاد رکھو۔ بل میں کبھی گڑبڑ نہیں کرنی چاہیئے۔ جیسا بھی بل ہو، جو بھی بل ہو پرسنٹیج تمہارا حق ہے۔ ٹھیکہ الاٹ کرنے سے پہلے ہی اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ غلط بل بنا کر اپنے آپ کو مجرم بنانا دانائی نہیں.... اور.... ہاں.... ان روپیوں میں سے دس بیس روپے چپراسی کو بھی دے دینا...."

اور وہ کمرے کے بیچ ہاتھوں میں نوٹ لئے بظاہر ایس ڈی او سے دفتری اصول اور ضابطے سیکھ رہا تھا۔ پر اُس کا جلتا اُبلتا ذہن یہ گتھی سلجھانے میں سرگرداں تھا کہ کس کے ارادے کامیاب ہو گئے....

..... کون معاشرہ کس معاشرے سے جیت گیا.... کون مذہب

کس مذہب پر حاوی ہوا۔ کیا ایس' ڈی' او ہندو بن گیا یا وہ خود

مُسلمان..... یا شاید....... شاید دونوں...........

چور.... بے ایمان۔

بوڑھاپا

"ہمارا لیڈر زندہ باد......... ہمارا رہنما زندہ باد .... ہمارا قاید زندہ باد ......" نعروں کی گونج کمرے میں پھڑپھڑانے لگی اور اس کی جُھریوں سے مزیّن چہرے پر کچھ اور جُھریاں اُبھر آئیں۔ کچھ برس پہلے جب کبھی وہ اپنے نام کے نعرے سُنا کرتا تھا تو فخر سے اُس کا سرتن جاتا تھا۔ نتھنے پھولنے لگتے۔ سینہ دھونکنی کی طرح زیر و بم کرتا اور سارے جسم میں خون کی روانی میں اتنی تیزی اور حدت پیدا ہو جاتی کہ اُس کا وجود سراپا آگ بن جاتا تھا جس کی لپیٹوں میں ظلم و جبر کی قوتیں جُھلس جُھلس جاتیں لیکن اب نعروں کی گونج کان کے پردوں کو کرخت سی لگ رہی تھیں۔ ارادوں کے ساتھ ساتھ سماعت کے پردے بھی بوڑھے ہو چلے تھے شاید......!

لمحہ بھر کے لئے اُس کے جی میں آیا روک دے نعرے لگانے والوں کو...... کہدے اُن سے کہ آج اُس کو ان کھوکھلے نعروں کی ضرورت نہیں......... بالکل ضرورت نہیں۔ بلکہ آج آہنی ارادوں کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ کسی کو روک نہ سکا۔ نعرے کھوکھلے سہی۔ لیکن نعروں کی گونج میں اس کی بوڑھی بیوی

کی کرب بھی آواز بالکل نہ اُبھر پاتی تھی جو حسب معمول بیویوں کی طرح زندگی کی شام سے ہی اُس کو یاد دلاتی آرہی تھی کہ اب وہ بوڑھا ہو چلا ہے۔ اُس کی امیدیں بوڑھی ہوگئی ہیں۔ اس کا وجود بوڑھا ہو رہا ہے۔ جن نعروں کو وہ آگ کی لپیٹیں سمجھ بیٹھا تھا وہ آگ کی لپیٹیں نہیں بلکہ آگ کی پرچھائیاں ہیں۔ وہ ناکارہ ہے۔ نا اہل ہے۔۔ وقت کا ساتھ دینے کے قابل نہیں جبکہ سارے جہاں نے وقت کا رُخ بدل دیا ہے۔ منزل بدل دی ہے اور اپنی بوڑھی زندگیوں کو پھر سے جوان کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ بیوی کی کرخت آواز کو بھلانے کے لئے اس نے ٹوپی کا زاویہ سنبھالنا شروع کیا اور آیئنے سے تانک جھانک کرتے ہوئے باہر کی طرف چل پڑا۔

اُس کو سامنے پاکر ساتھیوں، رفیقوں کے سر احترام سے جھک گئے۔ وہ کوٹھی کے دروازے کی دہلیز پر کھڑا چپ چاپ اپنے ساتھیوں، رفیقوں کو جانچنے پرکھنے لگا۔ کوئی جماعت کا پریذیڈنٹ تھا تو کوئی حلقہ کمیٹی کا سیکریٹری کوئی انجینئر تھا تو کوئی ٹھیکہ دار۔ کسی کا پیشہ وکالت تھی اور کسی کا ڈاکٹری۔ بظاہر سب ایک دوسرے سے متضاد تھے۔ پر اصل میں کائنات میں پھیلی زندگی کے ان گنت نکتوں میں کچھ اہم نکتے...... اپنی اپنی مخصوص شخصیت کے لبادے میں ملبوث۔ ہر نکتہ شاید گرد و پیش کا نمایندہ تھا لیکن اپنی اہمیت سے پوری طرح آگاہ......!

وہ بہت دیر ان ملتے جلتے نکتوں کو جانچتا رہا اور نکتے سانس روکے منتظر رہے کہ کب وہ آگے بڑھے۔ اُن کی قیادت کرے۔ اُن کو ایک لکیر میں پرودے۔

اور لکیر ترکش سے آزاد تیر کی طرح منزل کی طرف بڑھ جائے۔ بڑھ کر منزل میں پیوست ہو جائے۔ جس منزل کا تعین اُس نے ہوش سنبھالتے ہی کیا تھا۔ لیکن وقت نے جس کے نقوش دھندلا دیئے تھے شاید اپنے ہوش و حواس کے آخری لمحے قربان کرنے سے منزل کے خدوخال اُبھر آئیں۔ اس کو ابھی' اسی وقت' اسی لمحے روانہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ عمر بھر کی سعی بوڑھاپے کی بھول بھلیوں میں گم ہونے کا خطرہ تھا۔

اُس نے دہلیز سے آگے قدم بڑھایا اور ہلتے کانپتے نکتوں کا اژدھام ارادوں' امیدوں اور ولولوں کی لکیریں ڈھلتا گیا۔ بوڑھاپے کو نظر انداز کر کے وہ نعروں کے دوش پر یوں آگے بڑھنے لگا جیسے لہروں کے دوش پر کوئی نوزائیدہ طوفان ساحل کی حدوں سے ٹکر لینے کے لئے بڑھ رہا ہو۔

ڈیوڑھی پر اس کو کسی نے نہیں روکا۔ دربان اور محافظ اُسے جانتے تھے۔ پہچانتے تھے۔ اور زرخرید نوکر ہو کر ڈرتے بھی تھے۔ انہوں نے بلا کسی چوں چرا اس کو اندر جانے دیا۔ لیکن اس کے ساتھی' رفیق ڈیوڑھی سے باہر ہی رکے کے رکے رہ گئے۔ باغ پیروں تلے روندے جانے کا خطرہ تھا۔ وہ بھی کوئی احتجاج نہ کر پایا۔ قانون اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ ٹھیک ہی تو تھا۔ یہ باغ ...... باغ سے پرے ایوان ...... ایوان سے پرے پھیلا ملک اپنا تھا۔ تہذیب اپنی تھی۔ تمدن اپنا تھا۔ حدیں توڑ کر ساتھیوں' رفیقوں کو باغ روندنے کی اجازت دینا بیوقوفی ہو گی شاید ......!

باغ خوبصورت تھا۔ چاروں اور کیاریاں سجی ہوئی تھیں جن میں رنگ برنگے پھول جنت بے نظیر کی جھلک دے رہے تھے۔ کیاریوں کے بیچ چہار سو مخملیں سبزہ بچھا ہوا تھا۔ لمحے بھر کے لئے اس کے بوڑھے جذبات ایوان کے سامنے بنے فوارے میں الجھ گئے۔ فوارے کے حوض کے بیچوں بیچ سفید سنگِ مرمر کی عریاں مورتی گھڑا کولھے پر سنبھالے ایسے کھڑی تھی جیسے زبانِ حال سے کہہ رہی ہو کہ پیاسے آئیں اور پیاس بجھائیں۔ گھڑے سے منوں پانی، آبِ حیات چھلک چھلک کر بے دردی سے کالے سنگِ مرمر کے تاریک حوض میں گم ہو رہا تھا۔ اتنا لمبا سفر طے کر کے اس کو زور کی پیاس محسوس ہوئی۔ ڈیوڑھی کے باہر اس کے ساتھی رفیق بھی شاید پیاسے تھے۔ اکیلے پیاس بجھانی مناسب نہ تھی۔ اُس نے فوارے کو زبردستی اپنے ذہن سے نظر انداز کر کے ایوان کا رُخ کیا۔ جس کے بند دروازوں میں لگے رنگین شیشے اُسے اپنی کوتاہی پر مُنہ چڑاتے محسوس ہوئے۔

دروازے کے پٹ دبائے تو وہ حیران رہ گیا۔ دروازہ کھُلا نہیں، کیا ایوان کے مکینوں کو معلوم نہیں کہ وہ احاطے میں داخل ہو چکا ہے۔ دربان نے محافظوں نے اس کی آمد کی اطلاع ضرور دی ہوگی۔ ویسے ساتھیوں، رفیقوں کے نعرے بھی ایوان کے در و دیوار کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ جھنجھلا کر اُس نے دروازے پر لگے گھنٹی کے بٹن کو برابر دبائے رکھا۔ حتیٰ کہ کہیں اندر سے گھنٹی کا احتجاج بند دروازے کے باوجود اُس تک پہنچا۔ لیکن نہ دروازہ کھلا

اور نہ کھلنے کے آثار نمودار ہوتے۔

تب اُسے احساس ہوا کہ دروازہ جان بوجھ کر بند رکھا گیا ہے ورنہ اس کا سرتاپا سامنے آنے ہی آہنی دروازے ٹوٹ کر گر جاتے تھے۔ کیا واقعی وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ نہیں......... نہیں......... وہ بپھر کر باغ کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا اور اپنی سلگتی نگاہوں سے ایوان کے در و دیوار جھلسانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایوان کی سب کھڑکیاں بند تھیں۔ سب روشن دان بند تھے۔ جیسے یہ ایوان نہ تھا بلکہ کوئی تابوت تھا جس کی ہر درز وقت نے مٹا دی ہو۔

یہ شاید اس کی ہتک تھی۔ لیکن ساتھیوں، رفیقوں نے اس کو سوچنے کی مہلت نہ دی۔ نعروں کی گرج سُن کر اُس کا سر ایک بار پھر تن گیا۔ نتھنے پھولنے لگے۔ خون کی حدت اتنی تیز ہوئی کہ اُس کا وجود سرتاپا آگ کی لپیٹ بن گیا۔ جس کی تمازت اُبل اُبل کر ایوان پر یورش کرنے لگی۔

"اے اونچے ایوان کے مکینو۔ تم سمجھتے ہو گے کہ در و دیوار بند کر کے تم مجھ سے چھپ سکتے ہو۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ کب تک ایوانوں کی قُبوں کی آڑ میں چھپتے پھرو گے۔ بولو..... جواب دو۔ میں پوچھتا ہوں کب تک تم سیلاب پر بند باندھتے پھرو گے۔ بُزدلو...... باہر آؤ اور ایک بوڑھے نہتے کا مقابلہ کرو۔ بوڑھے نہتے کے ساتھ جوان امنگوں اور ارادوں کا سامنا کرو۔ میرے ساتھیوں، رفیقوں اور عوام کا سامنا کرو۔ جن کا خون نچوڑ کے جن کا جسم نوچ کے، جنہیں پیاسا مار مار کے تم نے یہ ایوان، یہ باغ، یا غیچے

یہ فوارے تعمیر کیے۔ دھوکے بازو...... دغا بازو...... باہر نکلو اور میرے

عتاب کا سامنا کرو..... نکلو..... باہر نکلو..... باہر نکلو......" وہ آگ اگلتا

رہا۔ اور تمازت پھیلتی رہی اور گیٹ کے باہر بکھرے نکتوں میں جدت ابھارتی

رہی۔ وہ آگ اگلتا رہا۔ اور دربان محافظ کوشش کرتے رہے کہ اس کے ساتھی

اور رفیق اندر نہ بڑھ آئیں۔ اندر جاکر روندھ نہ دیں کیاریوں پھولوں کو تحس

نہس نہ کر ڈالیں۔ ایوان کو مکینوں کو.....!

یکایک کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرا گئی۔ اس کا سر چکرا گیا اور وہ فوارے

کے حوض کے کالے سنگ مرمر کی منڈیر کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ یقین نہ آتا تھا

کہ ایوان کے مکین اس کو پتھر مارنے کی جسارت کریں گے۔ اس کو سنگسار کریں گے

منصور کو سنگسار کیا گیا تھا۔ یسوع مسیح کو دار پر لٹکایا گیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے

اس کو گھبرانا نہ چاہیئے بلکہ تاریخ کے ابواب میں ایک اور باب کا اضافہ کرنا چاہیے۔

تاکہ آنے والی نسل یہ نہ کہہ سکے کہ اس دور کا کوئی علمبردار نہ تھا۔ عمر گزر گئی تھی۔ لاٹھیوں

گولیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے۔ آج پتھر مارے جا رہے ہیں تو کیا پرواہ۔ اس کی

بوڑھی رگوں میں ابھی اتنا خون باقی ہے کہ پتھر کا جواب پتھر سے دے سکے۔ ان کا پتھر

ان کے سر پر مارے۔ اس کی نگاہیں مخملیں سبزے پہ پتھر ڈھونڈھنے لگیں۔ یکایک

وہ رک گیا۔ سامنے مخملیں سبزے پہ پتھر پڑا نہ تھا۔ بلکہ کرنسی نوٹوں کا گٹھا پڑا تھا۔

کوڑھ کے دھبے کی طرح عیاں۔

چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ منڈیر سے گرتے گرتے بچا۔ اور تب اسے محسوس

تھا کہ یہ اس کی ہتک تھی۔ واقعی ہتک تھی۔ جی میں آیا تہس نہس کردے اس باغ کو۔ نوچ ڈالے ان رنگ برنگے پھولوں کے پرخچے اڑا دے فوارے کی منڈیر کو۔ توڑ ڈالے اس ایوان کو........ کم از کم اتنی ٹھوکریں مارے سامنے پڑے کوڑھ کے داغ کو...... کہ سب کرنسی نوٹ فضا میں بکھر جائیں........ تحلیل ہو جائیں۔

ٹھوکر لگتے ہی کرنسی نوٹ کے گٹھے پر بندھا دھاگا ٹوٹ گیا۔ اور نوٹ آزاد ہو کر فضا میں پر کٹے پرندوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگے۔ ساتھیوں، رفیقوں اور دربان محافظوں کی تکرار چشم زدن میں ہوا ہو گئی۔ ایوان کے احاطے سے باہر راہ چلتے لوگوں کے قدم رک سے گئے۔ سب کی نگاہیں فضا میں منتشر ناچتے اڑتے نوٹوں پر جم گئیں جو دھیرے دھیرے اس کے سامنے زمین بوس ہو رہے تھے۔

گولیاں چلاتے یا سنگسار کرتے، ایوان کے مکیں تو وہ حسب معمول سب کچھ سہہ لیتا۔ لیکن آج ایوان کے مکین اس کے ماضی کو، اس کے حال کو، اس کے مستقبل کو...... نہیں...... اس کے وجود کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ وہ چیخنے لگا۔

"ارے۔ بے ایمانو..... کیا تم سمجھتے ہو کہ ان رنگین کاغذ کے ٹکڑوں سے تم مجھے بہلا سکتے ہو۔ ارے بیوقوفو...... کیا تمہاری یادداشت بھی تمہارے ضمیر کے ساتھ ساتھ مر گئی ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ میں نے آج تک اصولوں کی خاطر سرداری ٹھکرا دی۔ میں نے گولیاں کھائیں۔ لاٹھیاں سہہ لیں۔ جوانی جیلوں

نہ دانوں کی نظر کردی۔ ارے دلالو۔۔۔ گنج قارون بھی میرے قدموں تلے بکھر جاتے تو بھی میں اپنے ارادوں، اصولوں کی خاطر روندھ کر آگے بڑھ جاؤنگا آگے بڑھونگا۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ آگے بڑھونگا۔۔۔۔۔۔

وہ چلاتا رہا۔ چیختا رہا۔ گالیاں دیتا رہا۔ ترغیب دیتا رہا کہ ایوان کے مکین باہر قدم رکھیں۔ اُس کا سامنا کرلیں۔ لیکن ایوان کی کوئی کھڑکی نہ کھلی۔ نہ کوئی درز بھیل گئی۔ صرف اس کی ہر چیخ کا جواب، ہر گالی کا لاحاصل کرنسی نوٹوں کے گھٹے تھے جن کا ڈھیر ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اس کے پیر شل ہو گئے گھٹوں کو ٹھوکریں مارتے مارتے روندتے روندتے حتی کہ اب مشکل سے پیر اٹھا پا رہے تھے۔ گلا سوکھ گیا تھا۔ چیختے چلاتے حتیٰ کہ اب سرگوشی بھی مشکل سے نکل پا رہی تھی۔ الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ بکتے بکتے حتیٰ کہ اب بولنے کے لئے کوئی لفظ نہ سجھائی دے رہا تھا۔ تھک ہار کر اُسنے ڈیوڑھی کی طرف نگاہیں دوڑائیں۔

ڈیوڑھی کے باہر ساتھیوں، رفیقوں میں بے انتہا لوگوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جدھر بھی نگاہ جاتی تھی ادھر لوگ ہی لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ منزل کو سامنے پا کر شاید سارے ملک کے عوام اُمڈ پڑے تھے۔ کاش دربان محافظ اس کے ساتھی، رفیقوں کو نہ روکیں۔ کاش۔۔۔۔ تھکن کی یلغار سے اُس کا سر جھکنے لگا۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ تھوڑی سی اور ہمت کی ضرورت تھی۔ شاید زندگی نے

بوڑھاپے پر ترس کھا کر آخری موقعہ میسر رکھا اُس کے سامنے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے اُس کو یہ سُنہری موقعہ گنوانا نہ چاہیئے بلکہ تازہ دم ہو کر منزل پر ہی دم لینا چاہیئے۔ وہ جھکا اور کالے سنگ مرمر کے تاریک حوض میں سے چلّو بھر بھر کر پیاس بجھانے لگا۔

جونہی اُس نے حلق تر کر دیا ساتھیوں رفیقوں نے زور مارا۔ دربان لڑھک گئے۔ محافظ کچلے گئے۔ ساتھی رفیق کیاریوں پھولوں کو پھاندتے پھلانگتے، مسلتے روندھتے اُس کی طرف لپکے۔ جب تک وہ اُٹھ کر کانپتے ہلتے نکتوں کی لکیر کا رُخ ایوان کی طرف پھیرتا نکتوں کی لکیر ٹوٹ گئی اور چہار سُو پھیلے کرنسی نوٹوں پر بکھر گئی۔

کسی نے کسی کا بازو پکڑا۔ کسی نے کسی کا چہرہ نوچا۔ کسی نے کسی کا سر توڑا اور کسی نے کسی کا گلا دبا دیا۔ چیخیں، آہ و بکا، گالیاں اس کے ارد گرد ایسے طواف کر رہی تھیں۔ جیسے اُس کے مرتے بوڑھے جسم کے ارد گرد گدھ منڈلا رہے ہوں کہ کب اُس کی جان نکلے اور وہ اس کے مردہ جسم کو نوچ کھسوٹ لیں۔

کئی ساتھی رفیق لڑتے جھگڑتے اُس پر آگرے۔ اُس کا توازن بگڑ گیا۔ تب اس کو محسوس ہوا کہ وہ ابھی مرا نہیں ہے بلکہ ابھی زندہ ہے۔ اس کا سوکھا حلق تر ہے۔ اس کے ذہن میں توانائی ہے جس کی مدد سے وہ زندگی کے آخری لمحوں کو رنگین کر سکتا ہے اپنے وجود میں پھیلی ویرانیوں کو رنگین پرچھائیوں میں مدغم کر سکتا ہے۔

اُس کے نیم جان بدن میں بلا کی پھرتی عود کر آئی۔ ہاتھ پیر چل اُٹھے۔ کئی ساتھی رفیق لڑھک پڑے اور کرنسی نوٹوں کے کئی گٹھے اُس کی گہری جیبوں میں گم ہونے لگے ـــــــ تبھی ایوان کا دروازہ کھل گیا۔ ایوان کے مکیں باہر آگئے۔ اس کو تھام لیا اور بڑے احترام سے باغ میں پھیلی افرا تفری سے نکال کر ایوان کے اندر لے گئے۔

●

کولھو کا بیل

ایک......دو......تین......چار......ڈیڑھ دو ہزار تک تو وہ گنتا رہا۔ پھر اُس کا مُنہ تھک گیا۔ جبڑوں میں درد اُبھرا اور وہ سوکھے ہونٹوں کو زبان سے تر کرنے پر مجبور رہا۔ جوہی زبان مُنہ سے باہر نکلی تو فضا میں اُڑتی مہین گرد کی چادر زبان سے لپٹ گئی۔ گھبرا کر اُس نے زبان اندر کرلی۔ سارا مُنہ گرد سے بھر گیا۔ تھوکنا چاہا لیکن کدھر ......اس کے چاروں اور گیہوں اور بھوسے کا ڈھیر تھا۔ اناج پر تھوکنا پاپ تھا۔ ناچار اُس نے گرد سے لتھڑی تھوک گلے کی طرف دھکیل دی۔

نہ معلوم اُس نے کتنے چکر کاٹے تھے۔ کتنے من بھوسہ بنایا تھا۔ کتنی گیہوں خوشوں سے الگ کر دی تھی۔ لیکن چکر دنوں کے پھیر کی طرح ختم ہونے میں نہ آ رہے تھے۔ صرف انجن کی تمازت ٹانگوں کو بُری طرح جلائے جا رہی تھی۔

سیٹرنگ (steering) کو ایک ہاتھ سے موڑے رکھ کر اُس نے دوسرے ہاتھ سے آنکھیں مسلیں۔ فضا میں اُڑتے بھوسے کے تنکے

آنکھوں میں گھسے چلے آ رہے تھے۔ جی چاہا کہ کچھ دیر کے لیے آنکھیں میچ لے۔ لیکن بھوسے کے ڈھیر کے حدود کا بھی خیال رکھنا تھا۔ میچ لے آنکھیں تو شاید ٹریکٹر کھلیان کی حدود سے نکل کر پاس ہی کھیت میں کرسی پر براجمان ورک سپروائزر کو مسلتا چلا جائے۔ تب شاید اس کے بدن میں مچلتے وجود کو سکون مل جائے...... !

صبح سویرے چھ بجے سے وہ اس کام میں جوتا گیا تھا۔ لنگر (MESS) میں اس کو ایک منحنی سا کلچہ اور ایک چائے کا گلاس دیا گیا تھا۔ اور وہ بھی پھیکا پھیکا۔ دودھ کا تو بس نام ہی تھا چائے میں۔ روز اس کا جی چاہتا تھا کہ گلاس کو زور سے دے مارے زمین پر ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ کاش وہ توڑ سکے گلاس کو اور گلاس کی کرچیاں منیجر، ورک سپروائزر اور دوسرے افسروں کی آنکھوں میں ان بھوسے کے تنکوں کی طرح گھس جائیں۔ آدھی تنخواہ خوراک پر خرچ کرنے کے باوجود اہنیں پیٹ بھر سلیقے کا کھانا نہیں ملتا تھا اور مشکل یہ کہ کام کی نوعیت ایسی تھی کہ دن بھر خون پسینہ ایک کر کے اپنا کھانا پکانے کی سکت نہ رہتی تھی بدن میں۔ لیکن وہ کبھی گلاس توڑنے کی جرأت نہ کر سکا۔ گلاس ٹوٹ جائے تو تنخواہ میں سے دوگنی قیمت کی کٹوتی کی جاتی تھی۔

چائے وہ کب کا ختم کر چکا تھا۔ پانی کے ان گنت گلاس بھی اُس کے دہکتے پیٹ میں اُبل چکے تھے پھر بھی اس کو بھوک لگ رہی تھی۔ شاید ایک بج چکا تھا۔ یا شاید ابھی بارہ ہی بج گئے تھے۔ لگاتار چکر کاٹتے ہوئے گھڑی کی

سوئیوں کے چکر بھی چکرا اٹھے تھے۔ آخر کوئی کب تک وقت کا حساب رکھتا پھرے جب صرف اپنے سائے کو ہی پکڑتا رہے۔ کچھ گز کے اندر گھومتے رہو گھومتے رہو...... گھومتے رہو اور جھٹکے کھاتے جاؤ۔

جھٹکے کھا کھا کے اس کی ہڈی ہڈی الگ ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ تعجب تھا کہ وہ ٹریکٹر پر سے گر کر بھوسے کے ڈھیر پر بکھر کیوں نہیں گیا ابھی تک۔ کاش وہ گر جاتے۔ نرم نرم بھوسے کے ڈھیر پر لمبا پڑ جائے تو شاید بہت آرام آجائے اس کے شل بدن کو۔ بستر میسر نہ ہونے کے کارن اسکو کوارٹر میں گھاس کی چٹائی پر سونا پڑتا تھا۔ جس کا کھردرا پن بھٹی پرانی دری کے باوجود اس کے بدن کو حصّوں میں بانٹتا محسوس ہوتا تھا۔ کھردری چٹائی سے تو زیادہ ملائم تھا۔ یہ بھوسے کا ڈھیر۔ لیکن وہ ٹریکٹر پر سے گر نہ سکا۔ جان بوجھ کر بھی گر نہ سکا۔ ڈر تھا کہ کہیں گر کر ٹریکٹر سے بندھے (HARROW) کے توؤں کے نیچے آجائے جو گھاس کو بھوسے میں تبدیل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ نیچے آکر خدا حافظ ہی تھا دنیا کو اور وہ ابھی دنیا چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ ابھی اس نے دنیا دیکھی کہاں تھی۔ ہاں...... اگر کچھ دیکھا تھا تو صرف بھوک، بیکاری...... ٹھوکریں...... اور اس وقت بھی ٹریکٹر اس کے بدن پر مسلسل ٹھوکریں رسید کر رہا تھا۔ "پانی...." اس کا سوکھا حلق کراہ اٹھا۔

"مزدور گیا ہے پانی لانے ڈرائیور صاحب...... آرہا ہوگا"۔ ایک مزدور نے

بھوسہ ہوائیں اُچھالتے ہوئے کہا اور وہ "ڈرائیور صاحب" کے خطاب کو کڑوے گھونٹ کی طرح نگل گیا۔ جی چاہا کہہ دے مزدور سے کہ میں صاحب نہیں ہوں۔ ڈرائیور بھی نہیں ہوں بلکہ میں ...... میں شاید کولہو کا بیل ہوں۔ تم اپنی تکلیف کے پھیر میں بھول گئے ہو کہ ٹریکٹر کے جھٹکوں نے میرے انجر پنجر ڈھیلے کر دئے ہیں۔ لگاتار چکر لگاتے لگاتے میرا سر چکرا رہا ہے سٹیرنگ بازوؤں کو توڑتا جا رہا ہے اور انجن کی گرمی سارے بدن کو بھونے جا رہی ہے ..... نہیں ..... نہیں۔ میں شاید کولہو کا بیل بھی نہیں۔ کولہو کے بیل کے جذبات کا احترام کیا جاتا ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر اُسے سُنہری فریب میں رکھا جاتا ہے۔ میں کولہو کا بیل نہیں بلکہ کولہو کے بیل سے بھی گیا گذرا۔ آنکھیں کھلی رکھ کر مجھ سے توقع کی جاتی ہے کہ میں نگاہیں صرف اڑ کر دھیلے بھوسے کے ڈھیر تک ہی محدود رکھوں۔ نہ رکھوں تو زبردستی رکھی جائیں گی۔ جیسے اس بھوسے کے ڈھیر..... بھوسے کے ڈھیر کا احاطہ کئے فارم سے پرے کوئی دنیا نہیں۔ کوئی زندگی نہیں۔ لیکن وہ مزدور سے یہ سب کچھ کہہ نہ سکا۔ ورک سپروائزر کرسی پر بیٹھنے کی تھکن کو دور کرنے کی خاطر اُٹھ کر نزدیک بھوسے کے ڈھیر کو جانچ رہا تھا۔ آج تک دانے بھوسے الگ کرنے کا رواج تھا لیکن فارم مینجر کی سمجھداری نے اسے نئے تجربے کو جنم دیا تھا۔ اور داد بھی حاصل کر لی تھی۔ اور نئے تجربے کی خوشی میں سب مزدور بھول گئے کہ ٹریکٹر ڈرائیور کو بیل کی جگہ سونپ دی گئی ہے۔ انسانوں

کو حیوانوں کی جگہ سونپ دی گئی ہے۔ ایک ان پڑھ مزدور کو اس زاویئے سے سمجھانا ورک سپروائزر کی طاقت کو للکارنے کے مترادف تھا۔

یکایک اُسے بہت پیاس محسوس ہوئی۔ ٹریکٹر کے انجن کی گرمی واقعی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ وہ روک سکتا تھا ٹریکٹر کو 'بہانہ بنا سکتا تھا کہ انجن گرم ہو گیا ہے لیکن انجن کی گرمی کی گھڑی اُس سے بے نیاز معمول پر رکی تھی۔ اور ورک سپروائزر گرمی دکھانے کی گھڑی کی کارکردگی سے واقف تھا۔

اُسے ہنسی آ گئی انسان کی منطق پر۔ لوہے کے بے جان ٹکڑے ٹریکٹر کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے پانی اور پنکھے کا انتظام تھا۔ گرم ہو جائے تو یلا اجازت روک لو ٹریکٹر کو۔ کیونکہ کچھ روپے ضائع ہونے کا احتمال تھا۔ لیکن گوشت پوست کا زندہ انسان' جو ٹریکٹر بناتا ہے۔ روپے بناتا ہے۔ جل بھن کر راکھ ہو جائے۔ اُسے کام کرتے رہنا چاہیئے۔ پنکھا پانی نہ ہونے کے باوجود چلتا رہنا چاہیئے۔ ہنسی کی بات تو یوں تھی کہ یہ قانون بھی ایسے انسان بناتے ہیں جو خود ذرا سی گرمی لگنے پر سسک اُٹھتے ہیں۔ چلا اُٹھتے ہیں۔

ٹریکٹر کے پائیدان پر ایک ہی ڈھنگ سے ٹانگیں جمائے رکھنے سے اُس کی ٹانگوں میں جلن کے ساتھ ساتھ اینٹھن بھی ہو رہی تھی۔ ٹانگوں کو پھیلانا چاہا تو لاکھوں کروڑوں سوئیاں' چبھتی محسوس ہوئیں۔ ٹانگیں بھوسے کے مہین تنکوں سے بھری پڑی تھی۔ گھبرا کر اُس نے ٹانگوں کو پھر سے اپنی پرانی جگہ پر جما دیا۔ یہ بھی مصیبت تھی کہ ٹانگ اینٹھ جائے تو ہلانی منع ہے۔

قانون چھانٹنے اور انسانیت پھیلنے سے نہ تو سورج کی تمازت کم ہوگئی اور نہ ہی انجن کی گرمی۔ ہاں...... وہ شاید ٹریکٹر سے غافل ہوتا جارہا تھا اس لئے شاید ورک سپروائیزر اسے تیکھی نگاہوں سے تاک رہا تھا۔ ورک سپروائزر کا دھیان اپنی طرف سے ہٹانے کے لئے وہ زور سے چیخ پڑا "پانی نہیں آیا...... ٹریکٹر کے ریڈیٹر میں بھی پانی کم ہوگیا ہے۔"

وہ چڑچڑا ہوتا جارہا تھا۔ شاید تیز دھوپ کی وجہ سے یا شاید بدن میں پھیلتی تھکان کی وجہ سے ...... بھوسے کے تنکوں کی چبھن نے اس کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ لعنت ہو ایسی زندگی پر۔ کیا ضرورت ہے یہاں نوکری کرنے کی۔ یہ گورنمنٹ فارم نہ ہوا بلکہ کالے پانی کا جیل۔ اس سے تو اچھا تھا کسی دریا میں ڈوب مرنا۔ ڈوب مرے تو کیا فرق پڑے گا دنیا میں۔ لیکن ساتھ ہی اسے ماں کا جھریوں سے بھرپور چہرہ آنکھوں کے سامنے کوند گیا۔ بوڑھے باپ کی ہڈیوں میں اب اتنا رس نہ رہا تھا کہ تین جان سینچتا، پالتا۔ اس لئے پڑھائی ادھوری چھوڑ کر وہ اس فارم پر نوکری کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ گورنمنٹ فارم ہونے کے باوجود مزدوروں، مستریوں، ڈرائیوروں کا فارم کی ملکیت پر نفی کے برابر حق تھا۔ اوپر سے مینجر، ورک سپروائزر اور دیگر افسروں کی ڈانٹ پھٹکار۔ ہر افسر کی کوشش ہوتی تھی کہ مزدوروں، ڈرائیوروں اور مستریوں کو بے جان مشینوں کی طرح دوڑا دوڑا کے کام کا ریکارڈ قایم کریں۔ حکومت کے سامنے اپنے آپ کو بہتر ثابت کریں۔ ترقیاں حاصل کریں۔ ورک سپروائزر

ترقی پاکر منیجر بھی بن سکتا تھا۔ لیکن ڈرائیور، مستری، مزدور عمر بھر کی سعی کے بعد بھی ڈرائیور، مستری، مزدور ہی رہ جاتے تھے۔ کہنے کو تو وہ گورنمنٹ سرونٹ تھا لیکن اصل میں دق کا مریض ہو کر رہ گیا تھا جس کی زندگی خون تھوک تھوک کے بیت جاتی ہے۔ بابا نے کوشش کی تھی کہ منیجروں، ورک سپروائزروں کے چہرے پر تھوک دے لیکن ہر بار تھوک پلٹ کر اس کو خود چاٹنا پڑتی تھی۔ تب بھی پاپی پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے اس نے ورک سپروائزر کی بیکسی نگاہوں سے بے پرواہ ٹریکٹر کو روکا۔ زمین پر پاؤں رکھتے ہی دنیا گھومتی محسوس ہوئی۔ اور وہ لڑکھڑانے لگا۔

"بن پیئے نشہ......" اس کے منہ سے نکل گیا۔ اس کو شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ سکول کالج کے زمانے میں وہ بلاناغہ ہر مشاعرے میں پہنچ جاتا تھا، اور ہر اچھے برے شعر پر سر دھنتا تھا۔ جی چاہا کرتا تھا کہ وہ بھی شاعری کرلے۔ لے اور تال پر اپنی امنگوں، امیدوں اور ارمانوں کو پہچانے۔ حسین سپنے بنے۔ بھرپور تعبیریں لکھ لے۔ لیکن اس کے سب سپنے غریبی نے ہڑپ کر تھے۔ کتابیں، کاپیاں بنیے کی دکان پر سامان باندھنے کی پڑیوں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ ویسے اب اس کو شاعری کی ضرورت نہ تھی۔ دنیا میں شاعری سے بھی زیادہ سنگین مسئلے حل طلب تھے۔

"انسان، انسان کا دشمن کیوں...... یہ لوٹ کھسوٹ کیوں.. ....بھلا کیوں.... بھلا کیوں.... بھلا کیوں...... اس کا ذہن کسمسانے لگا۔

ڈرائیور صاحب ..... ہل رہے ہو اور سارا پانی گرا رہے ہو۔"

مزدور کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اور وہ کچھ دیر ان گھمبیر مسئلوں کو بھول کر پیٹ کے مسئلے کو حل کرنے لگا۔ پانی گرم تھا اور پیا نہ جاتا تھا۔ پر پیٹ بھرا محسوس ہونے میں مدد دیتا تھا۔ صبح سے اُس نے سیروں پانی پیا ہوگا۔ پھر بھی پیٹ میں بڑھتی بھوک سے چھٹکارا نہ مل رہا تھا اور ورکس سپروائزر کی تیکھی نگاہیں حیران نگاہوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ شاید سوچ رہا ہوگا کہ ڈرائیور مستری آدمی نہیں، حیوان ہے۔ صبح سے دو کنستر پانی پی گیا ہوگا۔ پانی پینے میں مل ملا کے دو گھنٹے ضایع ہو گئے ہوں گے۔ دو گھنٹے میں ۲۰ من اناج بھوسے سے الگ ہو سکتا تھا..... ! پانی پی کر اس کو حسب معمول تمباکو کی ضرورت محسوس ہوتی لیکن وہ بیڑی نہ سلگا سکا۔ کھلیان میں پھیلے فصل اور بھوسے کے ڈھیر میں آگ لگنے کا خطرہ تھا۔ کھلیان سے باہر جا کر بیڑی سلگانے کا سوال ہی نہ تھا۔ ورک سپروائزر منٹ منٹ کا حساب رکھتا تھا جس سے مہینے کی پگار پر اثر پڑتا تھا۔ وہ نشے کی طلب جبراً دبا کر ٹریکٹر کی طرف بڑھا۔

بے خیالی میں جو نہی وہ ٹریکٹر کی سیٹ پر بیٹھ گیا تو یکایک اُچھل پڑا۔ ورک سپروائزر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اتنی ہی دیر میں ٹریکٹر کی لوہے کی سیٹ تپ کر چولہے پر رکھے توے کی مانند تپ گئی تھی۔ اُسے تکلیف ہو رہی تھی۔ اور ورک سپروائزر کرم خوردہ دانت نکالے ہنس رہا تھا۔ وہ خون کا گھونٹ پی کے رہ گیا۔

یہ ورک سپروائزر نہ تھے بلکہ جلاد۔ جو افسروں کو خوش کرنے کے لئے مزدوروں
مستریوں ڈرائیوروں کا گوشت نوچتے پھر رہے تھے۔ دلال... حرام زادہ..
غصے میں آکر وہ سیٹ پر جم کے بیٹھ گیا۔ جلن بڑھتے بڑھتے سارے بدن کو جلانے
لگی۔ ہر مسام درد کا سوتا بن گیا۔ تکلیف کی شدت سے اس کے ہاتھ سٹیرنگ
کو بھینچتے رہے.... بھینچتے رہے۔ لیکن وہ جلتی سیٹ پر سے نہیں اٹھا۔
وہ کسی صورت میں ورک سپروائزر کو مزید ہنسنے کا موقعہ نہیں دے گا۔ گیئر
چرمرائے اور ٹریکٹر جھٹکے سے آگے بڑھا۔

چکر بدستور جاری تھے۔ انجن کی گرمی اور سورج کی تمازت بدستور
جلائے جا رہی تھی۔ بھوسے کے تنکے بدستور چبھتے جا رہے تھے۔ پسینہ بدستور
بہتا جا رہا تھا۔ ٹریکٹر کے جھٹکے بدستور بند بند کو الگ کرنے پر تلے ہوئے
تھے۔ اور مصیبت یہ کہ اس کا ٹریکٹر پر بیٹھنا ضروری تھا۔ یکایک وہ جھنجھلا اٹھا
یہ تو عمر بھر کا روگ تھا۔ بھلا بار بار اس سوچ کو دہرانے سے فائدہ۔ اسے کسی اور
سوچ کا سہارا لینا چاہئے۔ تاکہ کچھ دیر زندگی کے روگ کو بھلا سکے......

کھانے کی چھٹی ہوتے ہی وہ ٹریکٹر کھلیان میں ہی روک کر کوارٹر تک دوڑ لگا کے
پہنچے گا۔ کوارٹر میں گھسنے کی بجائے سیدھا لنگر (MESS) میں جائے گا۔ نہانے کی
فرصت کہاں۔ شاید آج مسور کی دال پکائی ہے باورچی نے۔ بس منہ پر کچھ پانی
کے چھینٹے اور کھانے کے لئے روٹی...... مسور کی دال.... پیاز کی چٹنی......
اس کی سوچ دور سے آتی ہوئی جیپ گاڑی میں الجھ گئی۔ منیجر جب جب

کرسی پر بیٹھے بیٹھے اُکتا جاتا تھا تو خود جیپ گاڑی لیکر فارم کی ہوا خوری پر نکل پڑتا تھا۔ کسی کو ٹوکتا، کسی کو ڈانٹتا لیکن عام طور پر مذاق کرتا رہتا تھا۔ ہنسی کے دو چار فقرے سُنا کر وہ سیدھے سادھے مزدوروں کو مغالطے میں ڈال دیا کرتا تھا۔ ہنسی کے دو چار بول سُن کر مزدور اپنے آپ کو بھول سا جاتا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اتنا بڑا افسر، فارم کا مالک، ایک معمولی مزدور کے ساتھ ہنس بول لے۔ ضرور منیجر کام دیکھ کر خوش ہوا ہو گا۔ کیا معلوم پگار بھی بڑھا دے منیجر وعدے ضرور کرتا تھا لیکن واپس اپنے آفس میں آرام دہ گدے دار سیٹ پر جب چھت سے لگے بجلی کے پنکھے کی ہوا اُس کے بدن کا طواف کرتی تھی۔ اور فرج میں سے ٹھنڈے شربت کا گلاس ہونٹوں سے مس ہوتا تھا تو وعدے پہلی ہی چسکی میں تحلیل ہو جاتے تھے۔

اس لئے منیجر کی جیپ نزدیک پہنچ کر ہر مزدور کی طرح اُس کے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ شاید کام دیکھ کر منیجر خوش ہو جائے، صبح سے تو ذرا بھی ناغہ نہ ہوا تھا کام میں۔ اُس کی بُری حالت دیکھ کر اُس پر ترس کھائے اور ابھی چھٹی کر لے۔ اب بھوک سہی نہ جاتی تھی۔ اس لئے منیجر صاحب پر اثر ڈالنے کے لئے اُس نے ٹریکٹر کی رفتار اتنی بڑھا دی کہ ٹریکٹر سنبھالنا مشکل ہونے لگا۔

ٹریکٹر گھومتا جا رہا تھا اور منیجر جانچ رہا تھا۔ Harrow کے توے بھوسے میں آسانی سے دھنس جاتے۔ ٹریکٹر کے پہیئے نکلنے کی کوشش میں

پھسلنے لگتے۔ بھوسے کی دیوار کھڑی ہو جاتی۔ ٹریکٹر دیوار سے ٹکرا جاتا اور جھٹکے سے دیوار پار کرتا۔ ہاتھ سٹیرنگ کو سنبھالنے کے لئے تن جاتے اور دوسرے لمحے جھٹکا اُس کے ہاتھوں میں اُبھرتے چھالوں میں سے گذر کر انگ انگ میں سرائیت کر جاتا۔

مینیجر نے اُس کو اشارہ کیا۔ لیکن وہ اَن سُنی کر گیا لیکن مینیجر آسانی سے ٹلنے والا نہ تھا۔ مینیجر کے ذہن میں خیال پیدا ہوا تھا اور غلط ہو کر بھی اس کو غلط تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مینیجر (SPACILIST) ماہر جو تھا۔ ورک سپروائزر کو بھیج کر اُس نے ٹریکٹر رکوا دیا۔ انجن کی آواز سرگوشی میں تبدیل ہو گئی۔ سارا کھلیان مدھم سی خاموشی میں ڈوب گیا۔

"تم (HARROW) کے توے اور گہرے کیوں نہیں کرتے۔ یہی کام کرتے ہو تم؟" مینیجر کے یہ الفاظ نہ تھے بلکہ بھوسے کے تنکے تھے جو اس کے وجود میں دور تک کھُبتے گئے۔

"لیکن جناب ٹریکٹر کے پہیئے پھسلنے لگتے ہیں اور ٹریکٹر سنبھالنا مشکل۔"

"پھسلنے دو۔ جب تم سے ٹریکٹر نہیں سنبھل سکتا تو ڈرائیور کیسے بن بیٹھے۔"

...... مینیجر کو ماتحتوں کی بات کاٹنے میں برتری کا احساس ہوتا تھا شاید۔ "اور ہاں .... آج کھانے کی چھٹی نہیں کرنا۔ کچھ منسٹر آرہے ہیں اس نئے کام کو دیکھنے کے لئے۔ اس لئے جب تک وہ چلے نہ جائیں گے کام ایسے ہی چلتا رہنا چاہئیے۔" مینیجر نے فیصلہ دیا۔

آسمان سر پر گرتا تو بھی اتنا اثر نہ ہوتا۔ سب ایک دوسرے کے چہرے تکنے لگے۔ چھٹی ہونے والی تھی۔ لنگر میں باورچی منتظر ہوگا لیکن کوئی کھانا کھانے نہیں جائے گا۔ مینیجر چلا جائے گا۔ خانساماں میز سجا دے گا اور وہ خود ٹریکٹر پر جھٹکے کھاتا جائے گا۔ کاش ورک سپروائزر ہی کچھ بول دے... یہ... وہ تو کسی بھی مزدور کو حکم دے کر اپنا کھانا منگا سکتا ہے۔ ناچار اُس نے منہ میں رستے لعاب کو نگلتے ہوئے خود ہی گزارش کی۔

"صاحب..... صبح سے کام میں جٹے ہیں۔ پیٹ بالکل خالی ہو گیا ہے۔" "ارے بھئی میرا بھی صبح سے پیٹ خالی ہے۔ ایک دن کھانا نہیں کھاؤ گے تو مر تو نہیں جاؤ گے۔" مینیجر ہنس ہنس کے کہتا گیا۔

مینیجر صاحب کے لئے یہ ضرور ہنسی کی بات تھی۔ صبح انہوں نے صرف دو چار توس مکھن لگا کے کھائے ہوں گے۔ ایک آدھ انڈا اور اس کو ہضم کرنے کے لئے کافی کے دو چار کپ پئے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے دفتر میں چپراسی نے دو چار چائے کے پیالے بھی پیش کئے ہوں۔ بس اور کچھ نہیں اور شاید مینیجر کو بالکل بھوک نہ لگی تھی۔ فارم کے دفتر سے کھلیان تک جیپ خود چلانے کے باوجود بھوک نہ لگی تھی۔ وہ کیا کہے کیسے کہے..... کیونکر کہے وہ... وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف بے بس، بے کس، بھوک آنکھوں میں چھلکنے سی لگی۔

"ارے تمہاری آنکھوں میں آنسو.............. اتنے لمبے چوڑے

ڈھیل ڈول کے باوجود" اس کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا اور اُس نے
پہلی بار فارم کے صاحب" منیجر" کی بات کاٹ دی۔
"نہیں منیجر صاحب...... بھوسے کے تنکے گھس آئے ہیں آنکھوں
میں"۔ اور بغیر کوئی جواب سُنے وہ ٹریکٹر کی اور مُڑ گیا۔ جہاں لوہے کی تپتی سیٹ
اُس کی منتظر تھی۔

دو بھائی

مکان دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ رشتہ داروں اور گاؤں کے لوگوں سے سارے کمرے اٹے پڑے تھے۔ ہر کمرے میں قہوے کے دور چل رہے تھے کونوں میں پھولوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ ہار گندھے جا رہے تھے۔ مالائیں بنائی جا رہی تھیں۔ پھولوں اور قہوے کی مہک آس پاس ساری فضا کو معطر کر رہی تھی۔ ہر کوئی انجانی سی خوشی میں سرشار تھا جیسے برات کی آمد کا انتظار ہو۔ چہار سو گہما گہمی تھی۔

شام لعل کا برا حال ہو رہا تھا۔ ایک تو رات بھر کمروں اور آنگن کی صفائی اور سجاوٹ کرنا پڑی تھی دوسرے صبح سے ہی مہمانوں رشتہ داروں کی تواضع کی خاطر قہوے کے بے شمار سماوار دم توڑ چکے تھے۔ لیکن آنے جانے والوں کا تانتا نہ ٹوٹ رہا تھا۔ اُس کے انگ انگ سے تھکن ٹپک رہی تھی۔ شانے بے انتہا بوجھ تلے دب کے رہ گئے تھے۔ اور قدم قدم پر ٹانگوں کی لڑکھڑاہٹ نمودار ہو رہی تھی۔ جوانی کے باوجود کٹھور وقت نے اُس کے جسم کو بوڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا کر دیا تھا۔ باپ کے سورگباش ہونے کے بعد سارا گھر اُس کے

ناتجربہ کار کندھوں پر آ گرا تھا۔ دو کنواری بہنیں، بوڑھی بیوہ ماں اور ایک چھوٹا بھائی۔ اپنی چھوٹی سی اراضی میں دن رات جوانی نہ لٹاتا پھرتا تو شاید کنواری بہنوں کی مانگ میں سیندور نہ بھر پاتا۔ بوڑھی بیوہ ماں کو زندہ نہ رکھ سکتا اور شاید اپنے ٹوٹے کچے جھونپڑی نما مکان کو کھنڈر میں تبدیل ہونے سے نہ روک پاتا۔ وہ آج نچلا کیونکر بیٹھے۔ آج اُس کا برسوں پہلے کھویا بھائی گھر آ رہا تھا۔

یقین نہ آ رہا تھا کہ اُس کا چھوٹا بھائی...... چھوٹو...... اُس کا چھوٹا بھائی جو باپ کے مرنے کے بعد بے قابو ہو گیا تھا۔ جو دن بھر گاؤں والوں سے لڑائی جھگڑا کرتا رہتا تھا۔ گالی گلوچ جس کا شیوہ بن گیا تھا اور گاؤں کی بہو بیٹیوں کو چھیڑنا ادنیٰ کھیل۔ جو سارے گاؤں میں لچے لفنگے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ عزت مٹی میں ملا دی تھی اُس نے گھر بھر کی اور جو آخر کار گھر سے بھاگ گیا تھا۔ وہی چھوٹو...... اُس کا چھوٹا بھائی گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ فوجی آفیسر بن کے آ رہا تھا۔ بہادری کا تمغہ حاصل کر کے آ رہا تھا۔ سارے گاؤں کی عزت بڑھا کر آ رہا تھا۔

بس آ گئی۔ گاؤں بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ ادھ گندھے مالائیں۔ گندھے ہار لیکر سب لوگ سواگت کو دوڑے۔ بلائیں اُتاری گئیں۔ ہار پہنائے گئے گلے ملا گیا۔ کچھ ہنسا گیا، کچھ رو یا گیا۔ شام لعل کی آنکھوں سے بھی آنسو پھوٹ پڑے۔ اُس کا بھائی تھا...... اُس کا چھوٹو تھا۔ بالکل ویسا ہی...... وہی

لمبے تڑنگے ہاتھ پیر وہی اکڑی ہوئی گردن۔ وہی تیکھا لمبوترا چہرہ جواب تھوڑا سا کالا ہو گیا تھا۔ صرف ایک خطرناک مونچھ کا ہوا تھا جس کے کنارے سانپ کی طرح لہرا رہے تھے۔

یار دوستوں نے چھوٹو کے ارد گرد گھیرا ڈال دیا۔ سبھی چھوٹو کو دیکھنا چاہتے تھے اُس کو چھونا چاہتے تھے۔ اس کے بدن پر لگے زخموں کے نشان دیکھنا چاہتے تھے۔ سارے مکان میں ہڑبونگ مچ رہی تھی۔ شام لعل کی خاموش زندگی میں ہل چل مچ گئی۔ ماں اور بہنیں چپک گئی تھیں۔ چھوٹو سے...... دنیا ما فیہا کو بھول کر، گاؤں کے مکان کو نظر انداز کر کے اُس کے تھکے وجود کو ایک دم فراموش کر کے چھوٹو کے جوان مضبوط وجود میں تحلیل سی ہو رہی تھیں۔ بھرے پرے گھر کے باوجود شام لعل کو اپنا آپ اکیلا سا محسوس ہونے لگا۔ لمحے بھر کے لئے اس کے تھکے ذہن میں خیال اُبھرا کہ شاید آج بوڑھی ماں اُس کی تگ و دو کو بھول گئی ہے۔ اُس کی بہنیں اس کی قربانی کو بھول گئی ہیں۔ اس کے رشتہ دار اس کے وجود کو بھول گئے ہیں۔ جیسے اُس نے دن رات پسینہ نہ بہایا تھا۔ خون پسینہ ایک کر کے گھر کی حفاظت نہ کی تھی۔ اپنے کنوارے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر بہنوں کو سہاگ سے نہ سنوارا تھا۔ بلکہ چھوٹو نے...... گھر سے دور فوجی آفیسر بن کر...... میڈل پا کر...... بہنوں کو سہاگ عطا کیا تھا۔ بوڑھی بیوہ ماں کو زندہ رکھا تھا۔ گھر کی رکھوالی کی تھی۔ لیکن دوسرے لمحے اُس نے زبردستی اپنی سوچ کا دھارا بدل دیا۔ لعنت تھی اُس کی سوچ پہ۔ شاید بدن کے ساتھ ساتھ اُس کا ذہن بھی بوڑھا ہو چلا تھا ورنہ وہ اپنی ماں، بہنوں اور چھوٹے بھائی کے

متعلق ایسے وسوسوں میں گرفتار نہ ہوتا۔ یکایک اُس کو تھکن کے بوجھ تلے بدن ٹوٹتا محسوس ہوا۔ اور وہ کمرے کی دیوار سے ٹیک لگانے پر مجبور ہو گیا۔

"مبارک ..... مبارک ..... سب کو مبارک۔ رحمان ڈار کی آواز کمرے میں پھٹ پڑی۔ یکایک ہلتے منہ رک گئے۔ گونجتے قہقہے ٹھٹھک گئے۔ فضا میں پھیلی قہوے کی خوشبو اور پھولوں کی مہک بوجھل ہو گئی۔ حتیٰ کہ ساری زندگی ٹھٹھر سی گئی۔ دیوار سے پیٹھ لگائے شام لعل تو منجمد ہو کے رہ گیا۔

یہ ٹھیک تھا کہ رحمٰن ڈار اسی گاؤں کا تھا اور گاؤں والوں کو ایک دوسرے کے غم و خوشی میں شریک ہونا چاہئیے۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ شام لعل اور رحمان ڈار کے کھیت ایک دوسرے سے ملے ہوتے تھے۔ کبھی رحمٰن ڈار کے کھیت کا پانی منڈیر میں سے رس رس کر شام لعل کے کھیتوں کو سیراب کرتا تھا۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ کھیتی باڑی کرنے وقت وہ صبح سویرے اکٹھے ہل لے کر اپنے اپنے کھیت میں پہنچ جاتے تھے ایک دوسرے کے دوش بدوش کڑکتی دھوپ اور کڑاکے کی سردی میں زمین جوتتے تھے۔ فصل بوتے تھے۔ فصل اگاتے تھے اور رات گئے جب تھکے ہارے واپس لوٹ آتے تھے تو دونوں ایک ہی پگڈنڈی پر شانہ بشانہ اپنے اپنے بیلوں کو ہانک کر لے آتے تھے۔ اور یہ بھی ٹھیک تھا کہ فرصت کے اوقات میں یا فصل کی رکھوالی کرتے وقت وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر گاؤں کے، ملک کے، دنیا کے مسائل پر ایک دوسرے سے تبصرہ کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹتے تھے۔ کچھ وقت ساتھ گزار کر

دونوں دعا و سلام کر کے اپنے گھروں کو لوٹتے تھے تاکہ دن بھر کی تھکن مٹا کر اگلے دن قدرت کی قوت سے برسرِ پیکار ہونے کے لئے تیار ہو جائیں۔

لیکن آج رحمن ڈار کو بھول کر بھی اُس کے گھر نہ آنا چاہیئے تھا۔ دوسرے دن آتا یا کسی اور دن۔ لیکن آج نہیں آنا چاہیئے تھا۔ رحمن ڈار کی وجہ سے ہی چھوٹو گھر سے بے گھر ہو گیا تھا اور قصور سراسر رحمن ڈار کا تھا۔ نہ ہی رحمن ڈار اُن کے کھیت کی منڈیر پر قبضہ جماتا نہ لڑائی جھگڑے پر نوبت آتی۔ لڑائی جھگڑا نہ ہوتا تو چھوٹو غصے میں آکر رحمن ڈار کا بازو نہ توڑ بیٹھتا۔ پٹواری کے غلط اندراج پر بھروسہ کر کے رحمن ڈار نے زیادتی کی تھی اور کچھ گز زمین کیلئے چھوٹو کو سزا ہو گئی۔ چھوٹو شرا تھا۔ لفنگا تھا لیکن اُس کا بھائی بھی تھا۔ شام لعل نے بہت واویلا مچایا۔ دہائیاں دیں لیکن قانون کے محافظوں کے پاس ایک نہ چلی۔ کچھ گز زمین کے لئے کسی کا بازو نہیں توڑا جاتا۔ چھوٹو کو کئی مہینے کی سزا مل گئی تھی۔ مصیبت تو یہ ہوئی کہ چھوٹو جیل سے سزا کاٹ کے بعد واپس گھر نہیں لوٹا اور وہ خود اکیلا...... بے سہارا کٹھور دنیا کی کٹھور قوت سے سر ٹکرانے پر مجبور ہو گیا تھا وہ تو بھلا ہو گزرتے وقت کا جس کی خصوصیت نے اس سارے واقعے پر ماضی کی چادر ڈال کر گاؤں بھر کے آلودہ ذہن دھو لئے تھے۔ واقعی آج رحمن ڈار کو کسی بھی حالت میں اُس کے گھر نہ آنا چاہیئے تھا۔

"سوچا آج خوشی کا دن ہے۔ مبارک باد دے جاؤں۔" رحمن ڈار نے اتنی سادگی سے کہا جیسے اُس کا بازو کبھی نہ توڑا گیا ہو۔ شام لعل کا بچ بستہ بدن

پُھر کچھ گرم ہو گیا۔

"مبارک باد مجھے دیا رے بچّے رحمان ڈار صاحب" چھوٹو شام لعل سے پہلے ہی بول پڑا۔ آواز میں بلا کی تیزی تھی۔ شام لعل سہم گیا۔ کہیں آج پھر چھوٹو اُس سے بچھڑ نہ جائے۔

"فوجی افسر بن کے آرہا ہوں اور پاکستان کی ایسی درگت بنا کے آیا ہوں کہ اب تک یاد کرتے ہوں گے چھوٹو کو......... یقین نہ آئے تو دیکھ لو...... یہ میڈل جیت کے آیا ہوں۔

شام لعل نے گھبرا کے چھوٹو کی طرف دیکھا۔ چھوٹو سینہ تانے ایسے کھڑا تھا جیسے مورچے پر کھڑا ہو۔ سینے پر ٹکے تمغے سے شرارے سے ... رہے ہے۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا۔ چھوٹو کی کرخت خوفناک دھاڑ مہلت تو دے سوچنے کی، سمجھنے کی۔

"میں نے اکیلے ہی پورے پاکستانی مورچے پر قبضہ کیا۔ پانچ پاکستانی مورچے میں پوزیشن لیے بیٹھے تھے میں جو عقب سے اُن پر نازل ہو گیا تو سب کے ہوش گم۔ پہلے کو تو میں نے بندوق کے کندھے سے ٹھوکا مارا تو اُس کے جبڑے ختم۔ دانت کڑ کڑا کر بکھر گئے۔ چاروں اور خون ایسے بہا جیسے فوارہ .... میرا اپنا منہ چھینٹ بن گیا اُس ملیچھ کے خون سے...... پھر کہاں ٹھہرتے وہ پاکستانی مجاہد...... جو بندوق کا کندہ دوسرے پر مارا تو اُس غازی کا قیمہ بن گیا۔ "ہائے اماں" بھی پورا نہ نکلا اُس کے حلق سے....

ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز ایسی لگی جیسے کسی کا بازو ٹوٹ جائے۔...... ہاہا......

ہاہا...." چھوٹو کا سینہ تن کر پتھر کی طرح سل ہو گیا۔ بازو ایسے لہرانے لگا جیسے

بندوق لہرا رہا ہو۔ شام لعل ڈرا ڈرا آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا......

سوچے سمجھے بغیر دیکھتا رہا۔ صرف دیکھتا رہا۔

" فوجی بوٹ کی نوک۔ تم لوگوں کو معلوم نہیں کتنی تیز ہوتی ہے۔ پوچھو

اُس تیسرے شہید سے جس کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ جاکے پوچھ رحمن ڈار۔"

چھوٹو کی آواز اتنی ڈراونی تھی کہ پل بھر میں کمرہ پاکستانی مورچے میں تبدیل

ہو گیا۔ کمرے میں موجود لوگ لاشوں میں بدل گئے۔ چاروں اور موت ہی موت

منڈلانے لگی۔

" باقی بھاگ گئے۔ بندوقیں چھوڑ کے بھاگ گئے...... سالے....

لیکن میں کیسے چھوڑتا اُن کو۔ ملک الموت بن کے تن گیا تھا اُن کے سروں پر۔

میرے بندوق نے ایک ایک کو چن کے ڈھیر کر دیا اور مورچے پر میرا قبضہ ہو گیا

..... میرا قبضہ......"

" چھوٹو......" شام لعل نے روکنا چاہا چھوٹو کو...... روکنا چاہا خون

اور غارت گری کو...... اس نفرت کے سیلاب کو جس نے سارے گھر پر......

سارے مکان پر...... ساری دُنیا پر یلغار کی تھی۔ لیکن اُس کی آواز جیسے چھوٹو

کے مُنہ سے نکلتی گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں مر کے رہ گئی تھی۔ دیوار کا سہارا نہ

ہوتا تو وہ خود بھی کب کا ڈھیر ہو گیا ہوتا۔

رحمن ڈار حیران و پریشان کچھ دیر کھڑا رہا اور پھر "کھیت پر" بڑبڑاتے ہوئے اُلٹے پاؤں لوٹ پڑا۔ اُس کے جاتے ہی چھوٹو نے بھیانک قہقہہ لگایا جیسے ایک اور مورچہ جیت آیا ہو۔

"مورچہ کتنا بڑا ہوتا ہے چھوٹو بھیّا" کسی معصوم بچّے کی آواز کمرے کی ویران فضا کو چاقو کی طرح کاٹتی چلی گئی۔

"یہی کوئی دو تین گز ....." چھوٹو نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا اور گرد بیٹھے لوگ لڑائی کی باریکیوں کے متعلق چھان بین کرتے رہے لیکن شام لعل کا کراہتا ذہن دو تین گز زمین کے ٹکڑے میں اُلجھ کے رہ گیا۔ دو تین گز زمین کے ٹکڑے کے لئے چھوٹو نے رحمن ڈار کا بازو توڑ دیا تھا اور قانون نے کچھ مہینوں کی سزا دی اور دو تین گز زمین کے ٹکڑے کے لئے چھوٹو نے پانچ انسان ذبح کئے اور اسی قانون نے اس کو بہادری کا تمغہ عطا کیا۔ پاگل دنیا کی پاگل ریت۔ چھوٹو کے گھر سے بھاگ جانے کو ماں بہنوں نے غنیمت جان لیا تھا، تیار نہ تھیں چھوٹو کا منہ دیکھنے کو۔ چھوٹو فوجی افسر بن کے آیا ہے تو منڈلا رہی ہیں چھوٹو کے گرد اور بالکل نظرانداز کر دیا ہے اس کو صبح سے۔ ایک پیالی قہوے کے لئے بھی کسی نے نہ پوچھا۔ شاید اُس کی ماں نہیں۔ اُس کی کوئی بہن نہیں۔ اُس کا کوئی بھائی نہیں۔ اُس نے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں۔ سب لوگ اُس کے درد دکھ سے بے نیاز خوش گپیوں میں مشغول تھے دیوار کے سہارے کے باوجود اُس کو اپنا آپ بے سہارا محسوس ہوا وہ چپکے سے باہر آگیا۔ کوئی تو نہ تھا اُس کا اس دنیا میں..... کہاں جائے ....

کدھر جائے اس کے بیر بے ارادہ بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے کھیت پر پہنچ گیا جہاں مٹی کا ڈھیلا ڈھیلا اُس کا جانا پہچانا تھا۔ گھاس کا ایک ایک تنکا اپنا تھا۔ سنسان کھیت میں اُس کو رحمن ڈار ملا۔ اُس کو کھیت میں دیکھتے ہی رحمن ڈار بول پڑا "شام لعل ... میں نے کسی بات کا بُرا نہیں منایا.... چھوٹو بچہ ہے۔ نا سمجھ ہے۔ تمہارے یوں یہاں چلے آنے سے لوگ کیا سمجھیں گے۔ تمہیں بھائی کو چھوڑ کر یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔" اور شام لعل اُبل پڑا۔

"کون بھائی ..... کس کا بھائی ..... چھوٹو میرا بھائی نہیں۔ ہم میں ایک بات بھی بھائیوں جیسی نہیں۔ میں کھیتی باڑی کرتا ہوں۔ فصل اُگاتا ہوں زندگی پیدا کرتا ہوں اور وہ .... وہ ویرانی پھیلاتا ہے، بم برساتا ہے زندگی کو ختم کرتا ہے۔ نہیں ...... نہیں وہ میرا بھائی نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا بھائی نہیں ہو سکتا رحمن ڈار۔ وہ میرا بھائی نہیں ہے۔ !"

"کیا کہہ رہے ہو تم۔ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے ہو" رحمن ڈار نے اُس کو روکنا چاہا۔ لیکن شام لعل رکا نہیں "ہاں ہاں .... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، وہ میرا بھائی نہیں ہو سکتا ....."

"اگر میرا بھائی کوئی ہو سکتا ہے تو تم ہو سکتے ہو۔ تم جو میری طرح کھیتی باڑی کرتے ہو، فصل اُگاتے ہو۔ زندگی کو پیدا کرتے ہو ..... تم ہو سکتے ہو میرا بھائی۔ صرف تم ..... تم ..... میرے بھائی ہو۔" شام لعل نے فرطِ جذبات سے کانپتے ہاتھ رحمن ڈار کے اور بڑھائے اور غیر ارادی طور پر رحمن ڈار کے ہاتھ شام لعل کے ہاتھ تھامنے کو آگے بڑھے۔

تلاش

سورج طلوع ہو رہا تھا اور کرنیں چھوٹے سے درے میں پھیل رہی تھیں۔ کرنیں پھیل رہی تھیں اور مغرب کی طرف پیٹھ کئے پہاڑ بے نقاب ہو رہا تھا۔ گھنا جنگل جو اب تک رات کی کالی چادر میں لپٹا پڑا تھا واضح ہونے لگا۔ سیاہ گہری لکیریں، بدھلوئیں اور دیواروں کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ دھوپ پھیلتی گئی اور دھند کے برفیلے مرغولوں کو چھیڑنے لگی۔ دھند کا مہین آنچل درخت کی چوٹیوں میں پھنس سا گیا تھا۔

دھوپ تیز ہوتی گئی اور سائے واضح ہونے لگے کہیں ہلکا ہرا رنگ، کہیں گہرا ہرا رنگ دلوں میں ہریالی بھرنے کے لئے کافی تھا۔ ٹھنڈی ہوا بے قرار سی ہو گئی اور پیڑ جو رات بھر کی لمبی خاموشی سے اکتا گئے تھے ہولے ہولے سرسرانے لگے دھوپ پہاڑ کے دامن تک پہنچ گئی۔ پہاڑ کے دامن میں بہتی چنچل ندی تک پہنچ گئی۔ اور ندی سے ذرا ادھر مکھنا کے کوٹھے تک پھیل گئی۔ ایک کرن چمنی کی راہ سے ہوتی ہوئی مکھنا کے چہرے پر گرمی کا احساس پیدا کرنے لگی۔ اور مکھنا جاگ پڑا۔ اُس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اندھیرے کوٹھے (ڈھوکے

کا جائزہ لیا۔ کرن کی اخیف کمزور روشنی میں وہ صرف کچھ گھڑے سائے ہی دیکھ سکا۔ مٹی کے کچھ برتن۔ الگنی میں لٹکا دودھ سے بھرا گھڑا، مکھن بنانے کی متھانی اور ادھ جلی لکڑیوں کے بکھرے ٹکڑے بھی۔ چہرے پر جھنجلاہٹ سی نمودار ہوتی جیسے وہ کچھ دیر اور سونا چاہتا ہو۔ کل بھی وہ رات گئے جنگل سے لوٹ آیا تھا۔ آنکھیں پتھرا گئیں تھیں شمعی کی راہ تکتے تکتے۔ شمعی کا خیال آتے ہی اس کو کچھ یاد آیا۔ ہاتھ اون کی کھردری واسکٹ کی جیب ٹٹولنے لگے۔ واسکٹ کی جیب کے اندر سے آتی ہوئی کھنکھناہٹ کی آواز نے اس کی جھنجلاہٹ دور کر دی۔ چہرے پر مسکراہٹ کی دھوپ پھیل گئی۔ جھٹکے سے بکری کی کھال کو دور پھینک کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ہڈیاں چٹخنے والی انگڑائی لی۔ پھرتی کی لہر اس کے انگ انگ میں دوڑ گئی۔ اور وہ سرہانے رکھا کلہاڑا اٹھا کر باہر نکل آیا۔

حسب معمول اس کی نگاہیں دیوار سے بندھی بھینس پر آجمی۔ کالی بھینس کی نیلی آنکھیں چم چم چمک رہی تھیں۔ اس کو سامنے پا کر کالی بھینس کی نیلی آنکھیں اور نیلی پڑ گئیں۔ وہ آگے بڑھا۔ بھینس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بھینس کے لمبے لمبے کانوں میں کھسر پھسر کرنے لگا۔ بھینس نے گردن موڑ کر غرور سے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرف دیکھا۔ بھیڑ بکریوں کا ریوڑ باڑہ میں جکڑا ہوا تھا۔ مکھنا کی جھپکتی آنکھیں ریوڑ کا جائزہ لینے لگیں۔ کچھ دنوں سے اس کو بھیڑ بکریاں روز گننے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ سردیاں نزدیک آرہی تھیں اور وہ سردیوں سے پہلے پہلے

زیادہ سے زیادہ بھیڑ بکریاں فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اب اُس سے اس ڈھوکے میں اکیلے نہیں رہا جاتا تھا۔ خود ہی کھانا پکاتے، دودھ دوہتے دوہتے مکھن بلوتے بلوتے وہ اب بالکل اُکتا گیا تھا۔

دفعتاً وہ ٹھٹھک گیا۔ اُس نے ریوڑ کا نئے سرے سے جائزہ لیا۔ ریوڑ میں کچھ کمی ضرور تھی۔ بھینس کو تھپ تھپا کے وہ بھیڑ بکریوں کے احاطے کی باڑ پھلانگ کر بھیڑ بکریوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے لگا۔ بھیڑ بکریاں بطور احتجاج ممیانے لگے۔ پر وہ اُن سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہا۔ اُس کا اندازہ غلط نہ تھا۔ ایک بھیڑ کم تھا، اور وہ بھی "کالیا" جو سارے ریوڑ میں اپنے موٹے خطرناک سینگوں کی وجہ سے ایک دم پہچانا جاتا تھا۔

اُس نے سارے احاطے پر ایک اور نظر دوڑائی۔ شاید ڈھوکے کے دوسری طرف ہو۔ پر ڈھوکے کے دوسری طرف نوکیلی چٹانوں میں بھی "کالیا" کا کوئی نشان نہ ملا۔

"سالا..... روز تنگ کرتا ہے۔ آج مار مار کے بھُرکس نہ نکال دوں تو مکھنا نام نہیں۔" بڑبڑاتے وہ ندی کی طرف ہو لیا۔

صبح سویرے سورج نکلتے ہی بھینس کو رسی سے آزاد کرنا مکھنا کا معمول تھا۔ لیکن آج تو انہونی بات ہو رہی تھی۔ بھینس نے رسی کو جھٹکا بھی دیا۔ ایک دو بار "اماؤ" بھی کیا۔ پر مکھنا کوئی دھیان دیئے بغیر ندی میں ادھ ڈوبے گول مٹول پتھروں کے سہارے ندی کو پھلانگ کر سامنے پھیلے گھنے جنگل میں گم ہو گیا۔

جنگل میں تاریکی پھیلی ہوتی تھی۔ کہیں کوئی سورج کی اِکّی دُکی کرن پتوں میں سے چھن چھن کر زمین پر اُجلے چمکیلے پھول بکھیر رہی تھی اور مکھنا ان پھولوں کو روندھتا مسلتا بڑھتا جا رہا تھا۔ بظاہر اُس کی نگاہیں زمین سے چپکی پڑی تھیں لیکن آنکھ کے گوشوں سے ارد گرد کا سارا جنگل اُس پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ زمین پر ان گنت گڑھوں کے نشان، کہیں کہیں پھسلن کی ہلکی سی لکیر اُسے جنگل کی خطرناک زندگی کا پتہ دے رہے تھے۔ اُس کے حواسِ خمسہ ہر آواز کو سُنتے، پرکھتے لیکن جس نشان کی اُسے تلاش تھی وہ کہیں نہ تھا۔ کالیا کے کُھر کا نام و نشان نہ تھا۔

بھیڑ کھو بھی جاتے ہیں۔ جنگلی جانوروں کے ہتھے بھی چڑھ جاتے ہیں اور ہر سال مکھنا کے چند بھیڑ بکریاں بھی جنگل کی نذر ہو جایا کرتی تھیں۔ اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ جنگل کا قانون ہے .... توازن ...... مکھنا کو جنگل پالتا تھا اور جنگل کے درندوں کو بھی جنگل پالتا تھا۔ لیکن "کالیا" کا کھو جانا مکھنا کے لئے چھوٹی بات نہ تھی۔ شاید کالیا کے جسم پر کالے گچھے دار بالوں کی چمک میں غیر معمولی کشش تھی۔! یا شاید اس کے موٹے ٹیڑھے سینگوں میں یہ راز پنہاں تھا۔ "کالیا" کا اکڑ اکڑ کر چلنا کسی بھی بھیڑ بکرے سے ٹکر لینا، جنگل میں چھپی قوتوں سے نہ گھبرانا۔ بلانے پر بھی پاس نہ آنا ...... شاید یہی وجہ تھی کہ مکھنا کو کالیا سے پیار کی حد تک اُنس تھا۔ کالیا کے جسم میں مکھنا کو اپنی خودسری پنہاں محسوس ہوتی تھی۔ بارہا مکھنا

کو محسوس ہوا تھا کہ اُس کی زندگی پہاڑ کے دامن میں بہتی چنچل ندی کے عین مشابہ ہے جس کا ایک کنارہ "کالیا" ہے اور دوسرا کنارہ شمعی۔ شمعی بوڑھی چمپئی کی یتیم پوتی تھی۔

سامنے نیلی چٹان عمیق ڈھلان پر بے حجابانہ آدھا دھڑ نکالے سارے درے پر چھاسی گئی تھی۔ نیلی چٹان بالکل نیلی نہ تھی۔ بھورے اور کالے رنگ کی کئی رگیں اُس پر ایسے پھیل گئی تھیں جیسے جنگل کی عمر رسیدہ روح پر وقت نے جھریاں پھیلا دی ہوں۔ مکھنا کے قدم غیر ارادی طور پر راستہ چھوڑ کر نیلی چٹان کی طرف بڑھے۔ نیلی چٹان کے ساتھ اُس کی کچھ ایسی یادیں وابستہ تھیں جن سے گریز ناممکن تھا۔ حتیٰ کہ وہ کالیا کے کھوج کی خواہش کو بھی ذہن سے کچھ دیر کے لئے مٹانے پر مجبور رہوا تھا۔

بچپن جوانی کی حدود کو چھو رہا تھا کہ جنگل نے اُس کی ماں کو نگل لیا۔ کیا معلوم کونسی گھاٹی اُس کی قبر بنی۔ باپ تو اُس کے پیدا ہوتے ہی جنگل کا ہو چکا تھا۔ لیکن اُسے ماں باپ کے مرنے کا اتنا دکھ نہ تھا جتنا اپنی تنہائی پر۔ جنگل کے باسی مارتے مرنے سے گھبراتے نہیں۔ لیکن تنہا جنگل کی قوتوں سے برسرپیکار رہنا بھیانک خاموشی سے دوچار ہونا بھو کھلانے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ ماں کے کھو جانے کے بعد ڈھو کے پر خاموشی کا طوفان سا ٹوٹ پڑا تھا اب نہ کسی کونے سے کوئی ڈانٹ، پھٹکار کی آواز آتی تھی نہ کوئی لاڈ پیار کی سرگوشی۔ ڈھو کے میں اکیلے

وحشت سے طاری ہو جاتی تھی اُس کا بس چلے تو راتوں کو بھی جنگل میں بسیرا کرے۔ کم از کم درختوں کی سائیں سائیں۔ جنگلی جانوروں کی دھاڑ چنگھاڑ تو تھی ہی جنگل میں لیکن جنگل میں رہنا خطرناک بھی تھا اس لئے طوعاً کرہاً وہ کسی طور رات ڈھوکے میں ہی بسر کرتا تھا لیکن پو پھٹتے ہی وہ بھیتس کو ڈھوکے کی رکھوالی کے لئے چھوڑ کر بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو لیکر نیلی چٹان کی راہ لیتا تھا۔ جہاں اس کی تنہائی جنگل کی وسعتوں میں گم سی ہو جاتی تھی۔ ریوڑ گھاس چرتے چرتے ڈھلان کے ادھر ادھر پھیل جاتا تھا اور وہ خود نیلی چٹان کے سپاٹ سینے پر لیٹا اپنی نگاہیں نیچے بہت نیچے گھاٹی پر مرکوز کرتا۔ پہاڑ کے دامن میں بہتی ندیا کی دودھیا لہر بے حس و حرکت نظر آتی۔ ندی کی گونج گرج نیلی چٹان تک پہنچتے پہنچتے پُراسرار سرسراہٹ میں تبدیل ہو جاتی تھی اور اس کو محسوس ہوتا جیسے ان بے ہنگم پہاڑوں جنگلوں کی روح اُسے لوری سُنا رہی ہو۔ وہ گھنٹوں درے پر نظریں جمائے گھاٹیوں ٹیلوں کو ٹٹولتا رہتا۔ اندھیری دراڑوں اور روشن درازوں کو کھوجتا پرکھتا۔ درے کے اُس طرف سامنے والے پہاڑ کی دُم تھی۔ دم کے بعد جنگل، جنگل کے بعد پھر پہاڑ...... پھر دُم...... پھر جنگل...... اور یہ سلسلہ آخر کار اُفق کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا تھا۔ اُچھلتی کھیلتی ندی کے متوازی ایک مردہ سی پگڈنڈی تھی۔ دفعتاً دور کہیں پگڈنڈی پر کوئی اُبھرتا نقطہ اُس کے نیم مردہ ذہن کو جھنجھوڑ دیتا وہ نقطے کو اپنے

ذہن میں تولتا جانچتا۔ یہ ہلتا نقطہ آدمی بھی ہو سکتا ہے یا کوئی جنگلی جانور۔ ریچھ تو ان جنگلوں میں کثرت سے پائے جاتے تھے پر، کہیں یہ نقطہ نہ آدمی ہو نہ ریچھ ہو بلکہ بھینس ہو۔ اُس کی اُلجھن خواہ مخواہ بڑھ جاتی تھی۔ وہ غور کرتا۔ بڑھتے نقطے کو پرکھنے کی کوشش کرتا۔ اپنی رائے بدلتا.......

پھر سے سوچتا حتیٰ کہ نقطے کے خدوخال پہچان کی حدود میں آکر واضح ہونے لگتے تھے اور جو کہیں اُس کا اندازہ صحیح ثابت ہوتا تھا۔ تو اُسے بے حد خوشی محسوس ہوتی تھی۔ جنگل کی روح شاید انہی چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھی رہتی ہے.... !

نیلی چٹان کے پاس پہنچ کر اُس نے نیلی چٹان کے پہلو میں عیاں دراڑ میں ہاتھ ڈال دیا۔ راکھ کو کرید کر اُس نے کچھ نکال دیا۔ بھُنی ہوئی مکی کے بھُٹے تھے۔ اُس نے رات کو ہی یہ بھُٹے بھون کر تیار کئے تھے شمی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دودھ لیکر آئے گی اور دونوں مل بیٹھ کر بھُٹے کھائیں گے۔ لیکن وہ کوئی بھُٹا نہ کھا پایا تھا۔ آنکھیں پتھرا گئیں تھیں سمی کی راہ دیکھتے دیکھتے۔ یکایک وہ جھنجھلا اُٹھا۔ کل شمی آگئی ہوتی تو شاید رات کو دیر سے ڈھوکے پر نہ پہنچتا اور پھر شاید کالیا بھی اندھیرے میں بھٹک نہ جاتا۔ اُس کو چاہئیے کہ کچھ بھُٹے کھا کر پیٹ کی دہکتی آگ کو سرد کر دے اور کالیا کی تلاش میں جُٹ جائے۔ شمی نے آنا ہوتا تو کب کی آگئی ہوتی اُس نے بھُٹوں کی طرف دیکھا۔ نیلی چٹان کی نیلی سطح پر اُس نے بھُٹوں کو

قرینے سے سجا دیا۔ داہنے ہاتھ سے بڑا سا بھٹا، اُس کے ذرا اِدھر چھوٹا بھٹا اور آخر میں ننھا سا بھٹا جسکے دانے یوں آتے ــــ انگاروں کی مانند دہک نہ رہے تھے۔

سورج سامنے والی پہاڑ کی چوٹی سے دو ہاتھ اوپر آگیا تھا۔ واقعی اب اُس سے بھوک سہی نہ جاتی تھی۔ کھالے ایک بھٹا تو کیا ہو۔ اُس کے ہاتھ بدستور بھٹوں سے کھیلتے رہے لیکن وہ کوئی بھٹا نہیں کھا سکا۔ اکیلے شمعی کے بغیر بھٹے کھانے میں کوئی مزا نہ تھا۔ یکایک وہ ٹھٹھک گیا۔ جنگل کی عام آواز میں اُس نے ایک نئی آواز کو پہچان لیا۔ اُس نے گردن موڑ کے دیکھا اور وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ کچھ دور دیواروں سے اُدھر سنہری ڈھلان پر شمعی سر پر چھوٹا سا گھڑا سنبھالے آرہی تھی۔ مکی کی روٹی جیسے سوندھے سوندھے گال۔ مکھن جیسے ملائم ہاتھ پیر۔ بادام جیسی آنکھیں... بھوک مٹتی سی محسوس ہوئی۔

"یوں گھور گھور کے کیا دیکھ رہے ہو" ناری کی سرسراہٹ ساز کی جھنکار میں گم ہوگئی اور وہ چونک پڑا۔ نہ معلوم شمعی کو دیکھ کر اُسے کیا ہو جاتا تھا۔ وہ سب کچھ بھول سا جاتا تھا۔

"کل کیوں نہیں آئی"... اُس نے یونہی پوچھا۔ شمعی کو دیکھ کر غصہ خود بخود کافور ہو جاتا تھا۔ کل چاچا آگیا تھا۔ فرصت نہیں ملی آنے کو......"

شمعی نے گھڑا سر سے اُتار کر احتیاط سے نیلی چٹان پر رکھتے ہوئے کہا اور

مکھنا بدھک گیا۔ وہ جانتا تھا کہ شمعی کا چاچا شمعی کی شادی اپنے بیٹے سے کرنا چاہتا تھا۔ مکھنا نے سپاٹ لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"کسی دن تمہارے چاچا کی لاش جنگل کے جانور کھا جائیں گے اور میری کلہاڑی پر خون کا کوئی نشان نہیں ہوگا"۔ شمعی مکھنا کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جنگل کی بیٹیاں خون خرابے سے نہیں ڈرتیں، وہ مکھنا کے غصے کو نظر انداز کر کے بول پڑی "دودھ لے آئی ہوں۔ بھٹے کھا لو......"

دونوں بھٹے کھانے لگے۔ یکایک مکھنا کو کچھ یاد آیا۔ اس نے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر کھنکھناتے بلور کے ٹکڑے نکال کر شمعی کے سامنے نیلی چٹان پر بکھیر دیے۔ نیلی چٹان کی نیلی سطح پر ستارے جگمگا اٹھے۔ شمعی نے مارے خوشی کے اس کی طرف شرمیلی مست نگاہوں سے دیکھا اور مکھنا سرشار ہو گیا۔ "کہاں سے ملے" شمعی نے سارے بلور کے ٹکڑے سمیٹ کر نہ جانے لہنگے کی کن لہروں میں گم کر دیے۔ جیسے بلور کے ٹکڑے ننھے کنواری برف کے ٹکڑے تھے جو شمعی کے دہکتے جسم کی حدت لگتے ہی اڑ گئے۔

"یہیں جنگل میں ملے...... اور چاہیے تمہیں...." مکھنا نے پوچھا اور ہاتھ شمعی کی طرف بڑھانا چاہا۔

"ہاں..... بہت سارے" شمعی مسکراتے ہوئے اس سے ذرا دور ہٹ گئی۔ مکھنا کچھ بجھ سا گیا اور شمعی مکھنا کی بیقراری دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مکھنا نے محسوس کیا کہ شمعی جب بھی ہنس پڑتی ہے تو جنگل کی دیوی کی طرح کھلکھلا

ہنس پڑتی ہے اور اُس نے دودھ کے گھڑے کو منہ سے لگا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

اچھا۔ اب چلوں ..... شمی نے خالی گھڑا سر پر جماتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری مرضی..... مکھنا کا لہجہ بدستور بجھا بجھا تھا۔" جا رہی ہو تو میرے ریوڑ کا بھی خیال رکھنا۔"

شمی نے پوچھا۔ کیوں تم واپس نہیں آ رہے ہو ....

"کالیا" کل رات سے غائب ہے اُس کو ڈھونڈ نکالنا ہے۔ پانی بھی پلانا ریوڑ کو۔ بھولنا نہیں" اچھا بابا اچھا..... پانی میں پلا دونگی۔ اور شمی مٹک مٹک کر جنگل میں غائب ہو گئی۔

شمی کے جاتے ہی جنگل کی خاموشی اور گہری ہو گئی۔ ندی کی سرسراہٹ پھر سے اُبھر آئی۔ فضا سائیں سائیں کرنے لگی۔ دفعتاً مکھنا کو محسوس ہوا کہ وہ اس مہیب جنگل میں اکیلا ہے..... بالکل اکیلا........ اور اکیلے ہی اُسے جنگل کا سامنا کرنا ہے۔ جنگل کو پچھاڑنا ہے اور زندگی کے کچھ اور دن جنگل سے چھیننے ہیں۔

وہ کئی ہیبت ناک پہاڑیاں پار کر چکا۔ کئی خطرناک گھاٹیاں پھلانگ گیا تھکن نے پیروں میں درد کی ٹیسوں کو رواں کر دیا۔ کندھے پر کلہاڑا رکھنے کی جگہ زخم سا اُبھر آیا تھا کہیں سے پانی گرنے کا شور اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جنگل سے آگاہ کر رہا تھا جہاں ہر درخت کے پیچھے خوف چھپا رہتا ہے سہا۔

ہر چٹان تلے ڈرناک ہیں ہوتا ہے اور ہر موڑ کی اوٹ میں موت مچلتی رہتی ہے

ہر جھاڑی کے تلے زندگی ہر لمحے تخریبی قوتوں سے برسرِ پیکار ہوتی ہے وہ جانتا

تھا اُسے اتنی دور انجانے جنگلوں میں نہیں آنا چاہیئے لیکن "کالیا" کو پائے

بغیر واپس جانا شکست کے مترادف تھا اور ایک دفعہ شکست تسلیم کر کے وہ

زندہ رہنے کا حق کھو دے گا۔ جنگل کے قانون اٹل تھے۔

سامنے جھاڑیاں گھنی ہو رہی تھیں اتنی گھنی کہ اُس جیسے ٹھیں ڈول رکھنے

والے آدمی کے لئے گھس جانا کٹھن تھا اُس کی تیز نگاہیں جھاڑیوں میں کوئی کمزور جگہ

ٹٹولنے لگیں جہاں سے اپنا راستہ بناتا۔ جھاڑیوں کی دونوں حدیں عمیق

ڈھلانوں میں منتقل ہو گئی تھیں جہاں آدمی تو آدمی جنگلی بکری کے پیر بھی لڑکھڑا

جاتے کہیں سے جھاڑیاں چرمرانے کی آواز آگئی شاید کالیا تھا اُس کا دل دھک

دھک کرنے لگا۔ جی چاہا دوڑ کے جائے۔ کالیا کو کھوج نکالے اور پکڑ کر خوب

پیٹے۔ پیٹتے پیٹتے جب تھک جائے تب کالیا کو گود میں بھر کر بھینچ لے......

بھینچ بھینچ کر پیار کرے۔ پیار کر کے اس کو اپنے اندر تحلیل کر دے لیکن اُس کے

قدم آگے نہ بڑھے۔ جنگل میں دوست دشمن کی پہچان یقینی نہیں ہوتی ذرا

سی لغزش مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے کالیا نہ ہو ریچھ ہو۔ جھاڑیوں

میں لٹکے لال لال دانے ریچھ کا من بھاتا کھاجا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے

کلہاڑے کو کندھے سے الگ کر کے ہتھیار کی طرح تھاما۔ ویسے ریچھ بھی ہو

تو گھبرانے کی ضرورت نہ تھی۔ جنگل کی زندگی بلاوجہ ایک دوسرے پر حملہ نہیں

کرتی۔ شاید یہی ایک عنصر تھا جس کی وجہ سے جنگل کی خوفناک زندگی میں بھی سکون رہتا ہے۔

جھاڑیاں چھوٹ گئیں اور مکھنا کے ذہن میں پلنے وسوسے مجسم ریچھ بن کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ کانٹے دار جھاڑیوں نے ریچھ کی کھال کو کئی جگہ سے پھاڑ دیا تھا۔ تھوتھنی پر بھی زخم لگے تھے۔ یقیناً غصے میں ہو گا۔ جب تک وہ کسی تنے کی اوٹ میں ہو جائے ریچھ نے اُسے بھانپ لیا۔ شاید ایک دم کسی کو سامنے پا کر بوکھلا گیا۔ وہ غراتا ہوا مکھنا کی اور لپکا۔ مکھنا کو لگا جیسے کوئی کالی چٹان پہاڑ سے آزاد ہو کر اس کی طرف لڑھکتی آ رہی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے خوف کی لہر مکھنا کے وجود کو لڑکھڑا گئی۔ جی چاہا ایک طرف ہٹ جائے۔ ریچھ شاید راستہ پا کر اُس پر حملہ کئے بغیر چلا جائے۔ پر مہلت نہ ملی ہٹنے کی۔ کوئی چارہ نہ تھا سامنا کرنے کا۔ چشم زدن میں اُس کا طاقتور بازو لہرائے لمحہ بھر کے لئے سورج کی کرنیں کلہاڑی کے پھل پر رقص کر گئیں دوسرے لمحے کالی چٹان سر پر آ گئی۔ پلک جھپکتے ہی اس نے کلہاڑے کو کالی چٹان پر دے مارا۔ کالی چٹان اُس سے ٹکرا گئی۔ اُس کا توازن بگڑ گیا۔ اور وہ مٹی کے حقیر ڈھیلے کی طرح ڈھلان پر لڑھکنے لگا۔

جب اُس کی آنکھ کھل گئی تو اُس نے محسوس کیا کہ ہوا میں کچھ تیزی آ گئی ہے فضا میں خنکی بڑھ گئی ہے اور اس کا سارا بدن اکڑ گیا ہے وہ بڑی مشکل سے اُٹھ بیٹھا۔ ٹخنوں پر زخم آ گئے تھے۔ کہنیاں بھی چھل گئی تھیں اور سر بھنّا جا رہا تھا اُس کی نگاہیں ذرا دور پڑے کالے بے حس ڈھیر پر مرکوز ہو گئیں۔ کالے ڈھیر میں کلہاڑے

کالسٹھا درخت کی طرح اُگا پڑا تھا۔ مردہ ریچھ کو دیکھ کر اُس کے ذہن میں کوئی خاص ردِعمل نہ ہوا۔ ایسے حادثات جنگل کا معمول تھے اگر کچھ اہمیت تھی تو یہ تھی کہ ریچھ کی کھال اوڑھنے بچھونے کے کام آئے گی، وہ آگے بڑھا۔ کلہاڑے کو ریچھ کے کندھے سے بمشکل الگ کر دیا۔ کلہاڑا ٹھیک کندھے کی ہڈی توڑ کر سینے تک پیوست ہو گیا تھا۔ اس کا وار اچھا تھا وہ بہت خوش ہوا۔ اُس نے کلہاڑے کے پھل کو مردہ ریچھ کے بالوں سے صاف کیا۔ ڈھلان پر اگی گھاس کے گچھے کاٹ لئے اور دیکھتے دیکھتے ایک مضبوط رسی بٹی۔ اس کے ایک سرے سے اُس نے ریچھ کو کس کر باندھ دیا۔ رسی کے دوسرے سرے کو پاس کے درخت کی ایک اونچی ٹہنی کے اوپر سے گزار کر کھینچنا شروع کیا۔ ریچھ کافی بھاری تھا۔ بہزار دقت اس نے مردہ ریچھ کو ہوا میں معلق کیا۔ رسی کا سرا تنے سے باندھ دیا اب اُس کا شکار جنگلی جانوروں کی دست برد سے محفوظ تھا۔

مشقت نے اُسے پسینہ پسینہ کر دیا۔ کہنیوں اور ٹخنوں میں درد بڑھ رہا تھا۔ دل چاہا کچھ دیر سستا لے۔ پر سستانے کے لئے وقت نہ تھا۔ سائے بہت بڑھ گئے تھے اور گھاٹیاں دھندلانے لگی تھیں۔ کائنات بہت لمبی تھی اور زندگی بہت کم۔ اُس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری۔ کلہاڑے کو تول کر کندھے پر لٹکا دیا۔ ایک آخری نظر معلق ریچھ پر ڈال دی اور لوئی کو گردن کے گرد سنبھال کر گھاٹی چڑھنے لگا۔ ابھی اس کو کالیا کی تلاش تھی۔

سلوٹ

موہنی کو دیکھ کر آج گمان نہ ہو سکتا تھا کہ یہ کالج کی شوخ و شنگ سر پھری تتلی ہے جو شیطان کے کان کترنے سے بھی گریز نہیں کرتی تھی۔ کہاں وہ بکھرے بال، شانوں پر ادھ گندھی چوٹیاں..... حیران و پریشان اور نازک جسم کی تھرتھراہٹ جو خواہ مخواہ ہر ایرے غیرے کے دل میں تھرتھراہٹ کا موجب بنتی تھی اور حسن کا بے باک تناسب دنیا کو سب کچھ بھولنے پر مجبور کرتا تھا اور کہاں آج یہ سیدھی سادھی سپاٹ مانگ ایک چوٹی اور وہ بھی قرینے سے گندھی ہوئی، جیل سے بوجھل پلکیں، سر پہ پلو جو مہین گلابی جارجٹ کا ہونے کے باوجود سر پہ سے ڈھلک نہ رہا تھا۔

اتنی سادگی اور پھر حسن کی سادگی، کہیں حسن کبھی ڈھک گیا ہے کسی لبادے میں، سادگی کی آڑ سے بھی اس کا حسن جھانک رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ موہنی کو سادگی بالکل پسند نہ تھی۔ گھر کی فکر، غریب باپ کے ضعیف بدن کی فکر، بھیا کے کی فکر، شاید اسی لئے وہ بیباکی کے لبادے پر بے درد زمانے کے تیر سہہ لیتی تھی۔ بے درد زمانے پر بیباک چانٹے مارتی تھی۔ بھلا کیوں نہیں، اس کی رگوں میں جوان خون کی مچل تھی اور رنگ رنگ میں پروان چڑھتی زندگی کے یہ تقاضے کچھ کم نہ تھے

آج کرائے کے مکان کے اس ننھی کمرے میں وہ بار بار ننھی سے آئینے میں.....
.....آنکھیں مٹکاتی، ناک چڑھاتی اور اپنے ہی چہرے کا مذاق اڑا رہی تھی۔
"کیوں...... دیوی جی۔ کہیں شرما کر دوہری نہ ہونا...... سر پر پلو ٹھیک سے ورنہ...... !" کہیں سے گھڑی نے دس بجا دیئے اور وہ چونک پڑی۔
دس بج گئے اور اُن لوگوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ رمیش نے تاکید کی تھی کہ وہ لوگ پورے نو بجے پہنچ جائیں گے۔ پتاجی کو بھی دفتر جانے میں دیر ہو رہی ہو گی۔ کیا وہ لوگ کبھی نہیں آئیں گے؟ کیا اُس کے سپنے صدا ہی بن کے ٹوٹ جائیں گے۔ اُف......
......کتنے سارے سپنے...... جیسے وہ سپنے نہ تھے بلکہ مٹی کے حقیر ڈھیلے جو ہر بار اُمید کا بوجھ نہ سہہ کر ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔ ایک سپنا ہوتا تو یاد بھی رہتا۔ کہیں ماں کے لاڈ پیار کا سپنا، کہیں بہن بھائیوں کا سپنا، کہیں کپڑے کھلونے کا سپنا۔ سپنے جو دکھ درد کی طرح ان گنت تھے اور مٹی کے ڈھیلوں کی طرح اس کے وجود کے اردگرد ٹوٹے پڑے تھے اور آج اپنے سارے ٹوٹے پھوٹے سپنوں کا انبار اکٹھا کر کے اُن کو اپنی جوانی، اپنے حُسن اور اپنے پیار سے گوندھ کر اس نئے سپنے کی تشکیل کی تھی۔ اُسے لگا کہ کہیں یہ سپنا ٹوٹ گیا تو وہ خود بھی ٹوٹ جائے گی۔ ایک حقیر مٹی کے ڈھیلے کی طرح ٹوٹ جائے گی۔
"نہیں...... نہیں...... نہیں" وہ بھڑک اُٹھی۔ آئینے میں اپنی پرچھائیاں عجیب سی لگیں۔ اپنی مضحکہ خیز صورت دیکھ کر بے اختیار ہنسی آئی۔ آئینے میں اپنی ہنسی بھلی لگی۔ جی چاہا ہنسے...... زور زور سے ہنسے۔ تاکہ زندگی کے دکھ

درد ہنستے ہنستے ہوا ہو جائیں۔ لیکن وہ زور زور سے نہیں ہنس سکی۔

آج تو اس کو سنجیدہ رہنا چاہیئے۔ آج اس کی زندگی کا مذاق نہ تھا بلکہ فیصلہ تھا عجیب دنیا کی عجیب ریت۔ کاش وہ اور رمیش کسی ایسی دنیا میں ہوتے جہاں خوف سے دل نہ دھڑکتے۔ جہاں آنکھیں نیچی کرنے کی نوبت نہ آتی اور جہاں کسی مصنوعی لبادے کی ضرورت نہ پڑے.... جہاں.... جہاں.... وہ آپ ہی آپ کھسیانی ہوئی۔ بھلا آئینے کے سامنے بیٹھے بیٹھے کہیں دنیا بدلی جاسکتی ہے....!

اُس نے دروازے میں سے اشتیاق بھری نگاہیں آنگن کی طرف پھیر دیں۔ آنگن میں اس کا باپ اکیلا انتظار کر رہا تھا اور وہ بے دل ہو کر رسوئی میں گھس گئی۔ رسوئی کے بیچوں بیچ کوئی چیز رنگین رومال سے ڈھکی پڑی تھی۔ اُس نے احتیاط سے رومال ہٹا دیا اور پلیٹوں میں سجی مٹھائیوں کو غور سے جانچا۔ اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ کبھی کبھار ہی گھر میں مٹھائیاں آتی تھیں۔ ان مٹھائیوں کو خریدنے کے لئے جتنا پیسہ خرچ ہو گیا تھا وہ شاید مہینوں تک گھر کے خرچ اور آمدن کا توازن بگاڑ کے رکھ دے۔ ایک ایک پیسے کا حساب رکھنا پڑتا تھا تب کہیں اس کی پڑھائی ہو رہی تھی۔ پر آج اس بیجا خرچ پر اسے رنج نہیں تھا۔ حلوا، برفی، بوندی کے لڈو..... ایک ایک دانہ موتی جیسا۔ چاندی کی طرح چم چم کرتی چائے کی کیتلی، کیتلی پر مُنہ چڑاتے کارٹون کی تصویر جیسے زبان حال سے دعوت دے رہی ہو۔

جن تفکرات نے اُسے ایک لمحہ پہلے گھیرا تھا وہ چشم زدن میں کافور ہو گئے۔ آج کا دن ہی کچھ ایسا تھا جب سارا وجود ڈانوا ڈول ہونے لگتا ہے۔

وہ رسوئی گھر سے نکل کر کمرے کے چکر کاٹنے لگی۔ آج کمرہ خوب سجا تھا۔ کمرے کے عین وسط میں کھڑی میز پر بچھا بے داغ میز پوش، میز کے گرد ہمسایوں سے اُدھار مانگی کرسیاں، گاؤ تکیوں سے مزین، کمرے کی کھڑکیوں میں پھیلائے گئے پردے، ادھر پتاجی کی چارپائی، اُس کونے میں اس کی اپنی چارپائی ..... چارپائیوں پر پھیلے پلنگ پوش، جن پر کڑھے رنگین پھول پھوٹے پڑ رہے تھے۔ یہ پلنگ پوش دراصل اُس کی سہیلیوں نے بنائے تھے۔ لیکن آج رمیش کو پانے کے لئے وہ انہیں اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے ظاہر کرنے پر بھی آمادہ تھی۔ گو اُسے جھوٹ بولنے سے سخت نفرت تھی۔

دیواروں پر آج مکڑی کا ایک جھالا بھی نہ تھی۔ خالی دیواریں ننگی محسوس ہو رہی تھی۔ کاش اُس نے کچھ فوٹو بھی اُدھار مانگ لائے ہوتے۔ صرف ایک فوٹو تھا۔ عقبی دیوار پر۔ فوٹو کے عامیانہ فریم پر پھولوں کی تازہ مالا لپٹی پڑی تھی۔ روٹھی ماں کو منانے کے لئے ایک معصوم بچے کا ایثار۔ وہ فوٹو کے سامنے رُک گئی۔ معمولی گاڑھے کی دھوتی میں اُس کی ماں کا بے جان چہرہ سپاٹ تھا۔ فوٹو کھنچواتے وقت اُبھری جھینپ فوٹو میں عیاں تھی۔ فوٹو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس کی ماں فوٹو کھنچواتے وقت کیا سوچ رہی ہوگی پر اُسے یقین تھا کہ اُس کی ماں جہاں کہیں بھی ہوگی اپنے بچے کے متعلق ہی سوچ رہی ہوگی ..... کاش اس کی ماں زندہ ہوتی تو .....

تو وہ اُسے نہلاتی، اُس کی کنگھی چوٹی کرتی، اُس کی ساڑھی سنوارتی۔ یہی کچھ تو کرتی ہیں مائیں اپنی بچیوں کے لئے ...... شاید پلو ٹھیک سے سر پر نہ رکھنے پر ڈانٹتی

بھی..... اور ماں کی فوٹو کو گھورتے گھورتے وہ اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کو نہ روک سکی۔ ماں تو بچھڑ ہی گئی۔ اب پتاجی بھی بچھڑ جائیں گے۔ جنہوں نے اسے باپ کی محبت کے ساتھ ساتھ ماں کے پیار سے بھی سرشار کیا تھا۔ اس کو کبھی محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ بے ماں کی بچی ہے اور اب یہ گھر کرایے کا مکان سہی مگر اس کا گھر تو تھا۔ مکان یہ کمرہ، یہ کھڑکی میں سے پرانے کنویں کا منظر..... سب کچھ بدل جائے گا۔ کیا پتاجی بھی بدل جائیں گے؟۔ پرائے دھن کو وداع کرکے بدل جائیں گے..... وہ سوچتے سوچتے رک گئی۔ خود غرض کہیں کی۔ پرائی ہوتی نہیں اور دیوار کھڑی کرنے پر تل گئی ہے اور بے چارے اس کے پتاجی بیٹی کی خاطر صبح سے آنگن میں کھڑے کھڑے اکڑ گئے ہوں گے۔ آج حقے کی طلب بھی نہ ہوئی ہوگی۔ معلوم کیا سوچ رہے ہوں گے۔ بیٹی کا باپ ہونا بڑا مشکل ہے اسے چاہیے کہ پتاجی کا دل بہلائے تاکہ وہ بھول جائیں کہ ان کی اولاد پرائی ہونے والی ہے۔ اس نے پلو سے آنسو پونچھے۔ آئینے میں چہرہ دیکھا چہرہ اداس لگا۔ وہ زبردستی مسکرا پڑی آئینے میں مسکراہٹ کا بھونڈا انداز دیکھ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور ماتھے سے چپکی چمکیلی بندی ماند پڑ گئی۔

یکایک اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا باپ تیزی سے کمرے میں آیا۔ چہرے پر گھبراہٹ طاری تھی۔ "کیا بات ہے پتاجی، کیا ہوا؟" وہ زبردستی اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ "بتاتا ہوں، بتاتا ہوں۔ پہلے دروازہ بند کرلو۔ اس کا باپ دھڑام سے چارپائی پر گر گیا۔ سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ زمیندار کو دیکھا..... تم دروازہ بند تو کرو۔"

"...کون .... زمیندار..."

"................ جس کا میں بہت پہلے کارندہ تھا.... باپ نے پلنگ کی چادر مروڑتے ہوئے کہا "وہی زمیندار.... جس کے ہاں پشتوں سے ہی ہمارا خاندان نوکر تھا۔" اُس نے پھر پوچھا۔ ہاں... ہاں وہی۔ بالکل وہی...... گلی میں گھوم رہا تھا۔" پتاجی نے بدستور چادر مروڑتے ہوئے کہا۔" اور ہاں..... جس نے آپ سے کہا تھا کہ تم اپنے آپ کو کتنا ہی ہمدرد ظاہر کرو لیکن ہمارے نوکر ہی تو ہو اور نوکروں کو مالک کے منہ نہیں لگنا چاہیئے۔ صرف آپ نے اُسے بنتی کی تھی کہ مزدور کسانوں پر ظلم نہ کرے۔ آپ دونوں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ کھیلتے تھے۔ بچپن گزارا تھا ایک ہی آنگن میں.... ایک ہی حویلی میں۔ رشتہ مالک اور نوکر کا سہی پر لگاتار ساتھ رہنے کی وجہ سے آپ کے دماغ میں فرق نہ آیا۔ ٹھیک ہے نا پتا جی! .... اُس نے کہتے کہتے پتاجی کے ہاتھ سے چادر دھیرے سے کھینچ لی۔" ٹھیک.. بالکل ٹھیک...... اور دیکھو نا.... اُس کے باپ نے کچھ کہنا چاہا لیکن فرطِ جذبات سے زبان گنگ ہوگئی اور وہ بے بس چادر میں پڑی سلوٹوں کو گھورنے لگا۔

"جب آپ نے اُسے ظلم سے باز رکھنا چاہا اُسی کی بھلائی خاطر.... مزدور کسان بغاوت پر آمادہ ہوگئے تھے تو اُس نے تھپڑ مارا تھا آپ کو...." اس نے کہا اور اس کا باپ غصے سے جلنے لگا۔" آپ چاہتے تو دو ہاتھ مار کر اُس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتے لیکن نہیں۔ آپ حرام خور نہیں تھے۔ نمک کھایا تھا اس گھر کا۔ اسلئے آپ نے ایک ہاتھ میں مجھے سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے کپڑوں کی گٹھڑی..... میں اتنی چھوٹی سی تھی نا پتاجی...." وہ چادر میں پڑی سلوٹوں کو سنوارتی گئی۔

"ہاں بیٹا.... بڑے دکھ اٹھائے ہیں نے۔ بن ماں کی دودھ پیتی بچی کو سنبھالنا، کام پہچاننا، کھانا پکانا.... پردیس میں اکیلا.... نہ کسی سے جان نہ پہچان۔ اُف.... بارہا میں نے سوچا کہ کس گناہ کی پاداش میں مجھے یہ سزا ملی"۔ اُس کا باپ اب تھرتھر نہ کانپ رہا تھا بلکہ غصے میں دھنک رہا تھا۔ "موقعہ ملے تو اُس کا بھرکس نکال دونگا۔"

"ہاں پتاجی! آپ کا بس چلے تو بوٹی بوٹی اڑا دیتے اُس کی.... لیکن غصے کی کوئی بات نہیں۔ اب تو زمینداری بھی چھن گئی ہوگی اُس کی۔ دردر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوگا کہیں"۔ اُس نے چادر کی سلوٹیں دُور کر دیں۔ لیکن باپ کے ماتھے پر ابھی گہری تھیں سلوٹیں۔

کبھی آہستہ کبھی زبردستی.... کبھی شانتی سے اور کبھی چمکار کر۔ وہ باپ کی زندگی میں پڑی سلوٹوں کو سلجھانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ بےباکی سے، ہمت سے، سوجھ بوجھ کے سہارے باپ کو ماضی دفن کرنے میں مدد کرتی تھی۔ ماضی اُن کے لئے مر چکا تھا اور مستقبل جوان۔ لیکن حال کے واقعے نے اس کے دل میں نئے موہوم سے ڈر ابھارے.... اُف ماضی کی پرچھائیوں کو آج ہی اُسکے مستقبل پر دھاوا بولنا تھا۔

شاید باپ نے بیٹی کے دل کی حالت بھانپ لی۔ اس لئے معمول کی طرح گھنٹوں بڑبڑاتے رہنے کی بجائے پُرسکون ہو گیا۔ "ارے پگلی۔ چھوڑ یہ باتیں۔ دہقان ہو گیا ہوگا وہ زمیندار کا بچہ۔ جا۔ رسوئی میں جا کے دیکھ۔ وہ لوگ آتے

ہی ہونگے۔ میں برآمدے میں آن کا انتظار کروں گا۔"

باپ کی بات ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ برآمدے میں آہٹ ہوئی ——
پتاجی باہر لپکے اور وہ ماضی کو حال کے گہوارے میں دفن کر کے مستقبل کا
انتظار کرنے لگی۔

لوگ اندر آ رہے تھے۔ اُس نے جلدی سے اپنا پو ٹھیک کیا۔ شرم کے
مارے وہ سکڑنے لگی۔ اشتیاق کے باوجود نظریں نہ اُٹھ پا رہی تھیں۔ کالج کی تو
اور بات تھی۔ وہاں وہ رمیش کو اتنا تنگ کر رہی تھی کہ رمیش پریشان ہو جاتا
تھا۔ یہاں کیسے سامنا کرے اُس کا۔ شاید وہ بھی ساتھ آیا ہو۔

"آیئے.... آیئے..... بہت بدل گئے ہیں آپ.... میرا مطلب ہے
اتنے برس بعد دیکھا ہے آپ کو" اوہ —— اُس کا باپ ہکلا رہا تھا۔ آج انہونی
سی بات ہو رہی تھی۔ "یہ موہنی ہے۔ میری بیٹی۔۔۔ وہی ننھی منی.... موہنی جی..
ہاں زمیندار صاحب۔"

وہ ہکی بکی رہ گئی۔ پلو اُٹھا کے سوالیہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا اور
اُسے محسوس ہوا جیسے پتاجی کی لڑکھڑاتی نگاہیں معذرت طلب کر رہی ہوں۔ گھر
آئے مہمان کو دھکے دیکر نکالا تو نہیں جا سکتا۔ چاہے مہمان کھٹور زمیندار ہی کیوں نہ
ہو۔ زمیندار کرسی پر بیٹھ گیا۔ اگر دسے اٹی چھڑی کو اجلے میز پوش پر بے پرواہی سے
ٹپک دیا۔ چھڑی کی ساری گرد میز پوش پر دو لکیروں کی صورت میں جم گئی اور موہنی کے
دل میں ہوک سی اُٹھی۔ موتے کو آج ہی آنا تھا۔ ٹھاٹ سے ایسے بیٹھا ہے جیسے ابھی

جائیداد سمجھ رہا ہے۔

"نمستے کر بیٹی" باپ کی آواز میں بے چارگی تھی۔

"نمستے" اُس کے حلق سے بڑی مشکل سے نکلا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس موٹے زمیندار کا منہ نوچ لے۔ جو اس کو ایسے گھور رہا تھا جیسے کھا ہی جائے گا۔

"کیا یہ تمہارا اپنا مکان ہے" زمیندار نے اُس کی نمستے کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کے باپ سے سوال کیا۔ "نہیں زمیندار صاحب۔ کرائے کا ہے۔" باپ نے اتنی بے بسی سے جواب دیا جیسے غریب ہونا جرم ہو۔ "اور یہ لڑکی ......

یہ لڑکی پڑھتی ہے کہیں" زمیندار نے ایسے پوچھا جیسے وہ گوشت پوست کی بنی نہ تھی بلکہ بے جان لکڑی کی بنی تھی۔

"ہاں زمیندار صاحب کالج میں پڑھتی ہے۔" باپ نے اُس کی طرف غرور سے دیکھا اور اس کے دل میں بے تحاشا خیال پیدا ہوا کہ کبھی یہ موٹا زمیندار کالج آئے تو رمیش سے ایسی درگت بنوائے گی.... ایسی درگت بنوائے گی کہ عمر بھر یاد کریگا۔

"بیٹا زمیندار صاحب کے لئے چائے لا" باپ نے اُس سے نظریں تو نہ ملائیں لیکن آواز میں تحکم تھا۔ شاید اُس کا باپ زمیندار پر جتانا چاہتا تھا کہ نوکری سے نکالنے اور گھر سے بے گھر کرنے سے وہ بھوکے نہیں مرے۔ اب وہ کیسے کرے انکار۔ مٹھائیاں تو رمیش کے گھر والوں کے لئے تھیں اور کھلانی پڑے گی اس موٹے زمیندار کو۔ شاید نگل کر ڈکار بھی نہ لے موا۔ رسماً انکار بھی نہیں کرتا۔

بے شرم۔ وہ تو شرافت تھی اُس کے باپ کی ورنہ زمیندار میں باپ جوتے رسید کرتا کمینے کو۔

اُس کی مجبور نگاہوں کے سامنے مٹھائی کی پوری پلیٹ صاف ہو گئی۔ اور وہ اتنی زمیندار نے اتنا کچھ کھا کے بھی ڈکار نہ لی۔ اُس کو باپ پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ زمیندار موٹا ہے تو کیا ہوا۔ باپ ایک اشارہ کرے تو وہ اکیلی جوتے سے زمیندار کی مرمت کر دیگی۔۔۔۔ ایسی مرمت کر دیگی۔۔۔۔۔۔ باپ نے اُس کی سوچ کو ایک بار پھر ٹوکا۔ "بیٹی زمیندار جی پوچھ رہے ہیں کہ کس کلاس میں پڑھ رہی ہو۔" "بی اے میں۔۔۔۔" وہ منہ بنائے بغیر نہ رہ پائی لیکن زمیندار نے کوئی بے رخی محسوس نہ کی۔ موٹی چمڑی چڑھی ہوئے تن پر۔ اُس نے فیصلہ دیا "ٹھیک ~~[illegible]~~" بہو رانی مجھے پسند ہے!

"آپ ہی کی ہے" باپ نے انکساری دکھائی۔ اور وہ جل ہی تو گئی۔

"میں کسی دن اسے اپنے ہاں لے جاؤں گا" زمیندار نے اپنی موٹی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور وہ بھڑک اٹھی۔ اُس کا باپ بھی ٹھٹھک کے رہ گیا۔

"میں۔۔۔۔ میں نہیں سمجھا زمیندار جی!۔۔۔۔" باپ کی زبان ابھی ٹھٹھک رہی تھی "رامو۔۔۔۔" زمیندار کی آواز میں بلا کا تحکم تھا۔ میں رمیش کا باپ ہوں۔"

آسمان سر پر گرتا تب بھی وہ گھبرا نہ جاتی۔ زمیندار نے اتنا تیز تیر مارا کہ وہ سنبھل نہ پائی۔ رمیش کا باپ یہ موٹا زمیندار۔ وہی زمیندار جس کی زمین چھن گئی

تھی۔ اور قافا عارے سے جس کو در بدر کی ٹھوکریں کھانی تھیں۔ یہ .... یہ اُس کے رمیش کا باپ۔ کئی کارخانوں کا مالک .... اُس کے باپ کا پُرانا مالک اور اب اُس کا مالک .... اُس کا سر چکرانے لگا۔

زمیندار بدستور کہے جا رہا تھا "رامو .... اکلوتے بیٹے کی خوشی میری خوشی ہے۔ رمیش کی خوشی کے لئے میں سب کچھ کرنے پر تیار ہوں۔ تمہاری بیٹی کو بہو بنانے پر تیار ہوں ..... کیا تم میری رائے سے متفق ہو ......" اور زمیندار جی کے پشتی کارندے رامو میں شاید تاب نہ رہی "آپ کی رائے زمیندار جی .... آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تو آپ کے چرنوں کی دھول ہوں اور موہنی آپ کی داسی .... کیا واقعی آپ اُس کو سویکار کریں گے۔ بیٹی .... بیٹی سُنا تم نے زمیندار صاحب رمیش کے پتا جی ہیں ..... رمیش کے پتا جی ہیں۔" برداشت کرنے کی سکت نہ رہی اُس میں۔ باپ کا ہر لفظ دہکتے سیسے کے قطروں کی طرح ٹپک رہا تھا اُس کے کانوں میں۔ جی چاہا .... رو کے باپ کو .... روک کر جھنجھوڑے .... جھنجھوڑ کر کہے .... کہدے .... کہدے کہ یہ وہ ظالم ہے جس نے تمہاری بے عزتی کی ہے۔ تمہیں تھپڑ مارا ہے۔ تم اور تمہاری بن ماں کی بچی کو در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا۔ تم اس کے سامنے کیوں گھگھیا رہے ہو۔ کیوں اس کے سامنے جھکے جا رہے ہو۔ کیوں اپنی بیٹی کی نظروں سے گرنے پر تُلے ہو۔ تم کتے نہیں، انسان ہو۔ میرے باپ ہو .... میرے باپ ہو۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ کہہ بھی دیتی تو کوئی فرق نہ پڑھتا۔ آج اُس پر حقیقت

میں ہو گئی تھی کہ اُس کے باپ کا غصّہ نفرت بنا دیتی تھی۔ اپنی کمزوری کو چھپانے کا بہانہ تھا۔ دکھاوا تھا۔ جھوٹ تھا۔ زندگی میں پڑی سلوٹوں کو بہلانے کے لئے تھا۔ نہ ہوتا تو شاید پہلے ..... بہت پہلے زمیندار کی لاش حویلی میں بکھر گئی ہوتی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اُس کا باپ ماضی کے پندرہ برس بظاہر حویلی سے دور رہا لیکن اصل میں حویلی کی چار دیواری میں مقید تھا۔ ذہنی طور پر زمیندار کا غلام تھا۔ اپنی محنت مزدوری کے باوجود اسی زمیندار کا ٹکڑا کھا رہا تھا۔ کتا بھلا مالک کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت کیسے کرے۔ اس کو اپنے باپ کی بے بسی پر رحم آ گیا۔ کتا تو ہڈی کے لئے بھی لڑتا ہے۔ لیکن اُس کا باپ ___؟

آج تک اُس نے اپنے باپ کا اپنے پیارے باپ کا حکم کبھی نہ ٹالا تھا۔ وہ دھیرے سے بول پڑی۔ حیرانی تو یہ تھی کہ کہتے کہتے اُس کی زبان بھی نہ لڑکھڑائی

"پتا جی! میں کسی نریش کو نہیں جانتی اور نہ ...... نہ جاننا چاہتی ہوں۔"

اور جواب سنے بغیر وہ رسوئی گھر کی طرف چل دی جہاں اُس کی آنکھوں میں اُمڈتے آنسوؤں کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔